نصرۃ میگزین

جمادی الثانی-رجب1444ھ جنوری–فروری2023ء

شمارہ-70

اسلامی خلافت ایک منفرد حکومتی نظام ہے

قطر اور مغرب کی اصلیت کو آشکار کرتا ہوا2022 کا فیفا ورلڈ کپ

شرعی احکام کا غلط نفاذ اسلام کو نقصان پہنچاتا ہے، اور لوگوں کو اسلام سے دور کرتا ہے

پاکستان کی ضرورت ایک نئی سیاست اور نئی ریاست کا قیام ہے، جس کی بنیاد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحی ہو اور یہ صرف خلافت کے قیام کے ذریعے ممکن ہے

فہرست

اداریہ 3

تفسیر سورۃ البقرۃ۔(236-237) 5

اسلام میں نظریہ نسوانیت کا رد 11

اسلامی خلافت ایک منفرد حکومتی نظام ہے 24

اسلام کا بین الاقوامی سمندری قوانین کے متعلق نقطہ نظر 31

قطر اور مغرب کی اصلیت کو آشکار کرتا ہوا 2022 کا فیفا ورلڈ کپ 45

شرعی احکام کا غلط نفاذ اسلام کو نقصان پہنچاتا ہے، اور لوگوں کو اسلام سے دور کرتا ہے 56

نفسانی خواہشات کا مقابلہ 59

پاکستان کی ضرورت ایک نئی سیاست اور نئی ریاست کا قیام ہے، جس کی بنیاد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحی ہو اور یہ صرف خلافت کے قیام کے ذریعے ممکن ہے 65

دین کی تجدید 70

سوال کا جواب: آخرت کے شہید کون ہیں اور شہید کا قرض کون ادا کرتا ہے؟ 91

سوال کا جواب: علاج کا حکم 96

سوال وجواب: عرب ممالک کے ساتھ چینی سربراہ کی ملاقاتوں کے اہداف 100

میڈیا سرگرمیاں 109

اداریہ

اسلام میں فوج کی قیادت کرنا ایک طرح سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کرنا ہے۔ اگر اس قیادت کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے طور پر نہ لیا جائے تو یہ گناہ اور ذلت کا سبب بن جاتا ہے۔ اور اگر اس قیادت کو صرف اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے طور پر لیا جائے تو یہ اجر عظیم کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے لئے زبردست حمایت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام کے ہر دور میں، فوجی قیادت کی بنیاد، جہاد کرنا ہی رہا ہے۔ جہاد اسلامی ریاست کی سرحدوں کے اندر ہی مسلم سرزمینوں کی حفاظت تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ اسلامی ریاست کی سرحدیں مسلسل پھیلتی رہتی ہیں۔ تمام انسانیت کی طرف اسلامی دعوت پہنچانے کی ذمہ داری اسلامی ریاست ہی اُٹھاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جزیرۂ عرب کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ روم و فارس کے حکمرانوں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ آپ ﷺ اسلام کی دعوت کا پیغام پہنچانے کے لئے وفود بھجواتے۔ آپ ﷺ ظالم حکمرانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے فوجی قائدین بھجواتے اور عملی طور پر اسلام کا نفاذ کرتے تھے۔

خلافت نے بھی اسی طرح صدیوں تک سُنتِ نبوی ﷺ کی پیروی کی۔ حتیٰ کہ جابر حکمران بھی اسلامی افواج کا سامنا کرنے سے لرزتے تھے۔ اور خلافت تین برِّاعظموں پر محیط ریاست تک پھیل گئی اور یوں تقریباً تمام دنیا کا ورلڈ آرڈر اسلام سے تشکیل پانے لگا۔ اسلام کے عملی نفاذ کی برکتیں دیکھ کر لاکھوں لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والی اسلامی امت کا وجود ہی اسلامی دعوت، جہاد اور خلافت کے پھیلاؤ کا واضح ثبوت ہے۔

آج خلافت کے انہدام کے بعد سے فوجی کمانڈ کا تعین مغربی استعماری نظام سے ہوتا ہے۔ اتنی وسیع و عریض اسلامی اُمت وریاست ایک واحد خلافت میں متحد ہونے کی بجائے قومی ریاستوں میں بٹ چکی ہے۔ اسلام کی وحدانیت تلے ایک متحد قوت بننے کی بجائے، مسلمان قومی سرحدوں کے معمولی تنازعات پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے دَرپے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن، ہمارے حکمرانوں اور فوجی قائدین کے ساتھ الحاق کرکے انہیں احکامات دیتے ہیں اور اُن سے اپنے مطالبات منواتے ہیں۔

آج کے ہمارے دور میں اسلام کے نفاذ کے لئے فوجی حمایت مہیا کرنا نہ صرف فوجی قائدین پر لازم ہے بلکہ یہ وقت کی اشد ترین ضرورت بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت کے فوجی قائدین سے نصرۃ (مادی مدد) کے حصول کے لئے انتہائی سرگرم تھے۔ یہ انصار کے فوجی قائدین ہی تھے جنہوں نے اسلام کی حمایت کے لئے نصرۃ فراہم کرکے اس دنیا میں اعزاز اور آخرت میں عظیم درجات حاصل کیے۔ طویل مُدت سے مصائب جھیلتی اُمت، اب مسلح افواج میں اپنے بیٹوں کی راہ تکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور دوبارہ اسلام کے حق میں تاریخ کا پانسہ پلٹ دیں۔

فہرست

تفسیر سورۃ البقرۃ۔(236-237)

جلیل قدر عالم دین شیخ عطاء بن خلیل ابو الرشتہ کی کتاب "التیسیر فی اصول التفسیر" سے اقتباس

﴿لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمْ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۔وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلاَّ أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلاَ تَنسَوْا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

"تم پر اس میں بھی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ تم عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو جبکہ ابھی تم نے ان کو چھوا بھی نہ ہو اور نہ ان کے لیے کوئی مہر مقرر کیا ہو۔اور (ایسی صورت میں) ان کو کوئی تحفہ دو، خوشحال شخص اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق بھلے طریقے سے یہ تحفہ دے۔یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے(236)اور اگر تم نے انہیں چھونے سے پہلے ہی اس حالت میں طلاق دی ہو جبکہ ان کے لیے (نکاح کے وقت) کوئی مہر مقرر کر لیا تھا تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا تھا، اس کا آدھا دینا (واجب ہے) سوائے اس کے کہ وہ عورتیں رعایت کر دیں (اور آدھے مہر کا بھی مطالبہ نہ کریں) یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے (اور پورا مہر دیدے) اور اگر تم رعایت کرو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔اور آپس میں فراخ دلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو۔جو عمل بھی تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اسے دیکھ رہا ہے"(237)

اللہ سبحانہ وتعالی مذکورہ بالا دو آیات کریمہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :

1- مردوں پر ایسی صورت میں مہر دینے کی کوئی ذمہ داری نہیں، اگر وہ اپنی بیویوں کو اس طرح طلاق دیں کہ ان کے لیے نہ تو مہر مقرر کیا ہو اور نہ ان سے ہمبستری کی ہو، بلکہ ایسی حالت میں ان پر صرف یہ لازم ہے کہ اپنی مطلقہ بیویوں کی خاطر مدارت کے لیے انہیں کوئی تحفہ دے دیں، جس سے وہ فائدہ اٹھائیں، جو طلاق کی پریشانی میں ان کو کوئی فائدہ پہنچا دے، اس میں کوئی خاص مقدار متعین نہیں، البتہ مرد کی خوشحالی اور استطاعت کے مطابق ہونا چاہیے۔

اس کو مُتعہ کہتے ہیں، یہ شوہر پر فرض ہے، ابنِ جریر نے روایت کی ہے: "حدیث کا راوی کہتا ہے: جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا ﴿**مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ**﴾ **"بھلے طریقے سے یہ تحفہ دے، یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے"**، تو ایک آدمی نے کہا: میں بھلائی کرنا چاہوں تو کردوں گا، ورنہ نہیں کروں گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس پر اگلی آیت کریمہ نازل فرمائی: ﴿**وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ**﴾ "طلاق یافتہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا متقیوں پر ان کا حق ہے" (البقرۃ: 241)، جس سے معلوم ہوا کہ متعہ دینا فرض ہے۔

تو صاحب استطاعت یعنی خوشحال پر لازم ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق متعہ دے اور غریب آدمی پر اس کی حیثیت کے مطابق دینا لازم ہے، لیکن کسی بھی صورت میں آدھے مہر سے زیادہ کوئی چیز واجب نہیں، خواہ شوہر مالدار ہو یا فقیر، کیوں کہ اگلی آیت واضح کرتی ہے کہ آدھا مہر اس عورت کا حق ہے جس کے لیے مہر تو متعین کیا گیا ہو لیکن ہمبستری کیے بغیر اسے طلاق دی گئی ہو۔

ہم نے ﴿**لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ**﴾ کے معنی اس طرح کیے کہ **"تم پر مہر کی ذمہ داری نہیں"**، ہم نے یہ نہیں کہا کہ تم پر کوئی گناہ نہیں، اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: یہ کہ تم پر طلاق دینے میں عام طور پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ شریعت کے احکامات کے مطابق ہو، خواہ عورت مدخول بہا ہو یا مدخول بہا نہ ہو، یعنی اس سے ہمبستری کی ہو یا نہ کی ہو۔

دوسری وجہ: شرعی دلائل اس عورت کے لیے مہر واجب کرتے ہیں جس کے لیے مہر متعین نہ کیا گیا ہو اور ہمبستری کے بعد اسے طلاق دی گئی ہو، یعنی ایسی عورت کو مہر مثل یعنی عرف کے مطابق مہر دیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں آیا ہے: **((بالنسبة للمراة التی لم یسم لها مهر و دخل بها فجعل لها رسول الله ﷺ مهر مثلها))** **"جس عورت کے لیے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو، اور ہمبستری (کے بعد اسے طلاق دی جائے) ایسی عورت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے مہر مثل مقرر کیا"** (بیہقی 105/7، الدر المنثور 701/2)۔

اور ایسی طلاق یافتہ عورت جس کے لیے مہر تو مقرر کیا گیا ہو اور ہمبستری سے پہلے اسے طلاق دی گئی ہو، اس کے لیے مقررہ مہر کا آدھا حصہ مقرر کیا۔

اب وہ عورت جس کے ساتھ ہمبستری نہیں کی گئی اور اس کے لیے مہر بھی مقرر نہ کیا گیا ہو، (اور اس کو طلاق دی جائے) تو اسلام نے اس کے لیے مہر مثل کا آدھا مقرر نہیں کیا، بلکہ اس کے لیے مرد پر حسب استطاعت متعہ مقرر کیا ہے، اس کو مہر نہیں کہتے، اس لیے ہم نے کہا کہ ﴿**لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ**﴾ کا مطلب ہے کہ **"تم پر مہر کی کوئی ذمہ داری نہیں"**۔

﴿**مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ**﴾ **"جب تک تم نے اسے نہ چھوا ہو"**، یعنی جب تک تم نے ان سے جماع نہ کیا ہو۔

﴿**أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً**﴾ **"یا تم نے ان کے لیے مہر مقرر نہ کیا ہو"**۔ (**أَوْ**) یہاں (و) کے معنی میں ہے یعنی ﴿**لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ**﴾ **"تم پر مہر کی ذمہ داری نہیں"** اور ﴿**مَتِّعُوهُنَّ**﴾ **"انھیں تحفہ دو"**، یہ دونوں احکامات دو باتوں کے ساتھ مشروط ہیں۔ اول: عدم دخول یعنی ہمبستری نہ ہونا، اور دوئم: مہر کا طے نہ ہونا۔ لہذا یہاں (**أَوْ**) دو میں سے ایک امر کو اختیار کرنے کے لیے نہیں (یعنی "یا" کے معنی میں نہیں بلکہ "اور" کے معنی میں ہے)۔

2۔اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالی دوسری آیت میں بیان فرماتے ہیں کہ ایسی طلاق یافتہ عورت کے لیے جس کے ساتھ ہمبستری نہ کی گئی ہو،اور اس کا مہر مسمیٰ ہو،تو مہر مسمیٰ کا آدھا حصہ اس کو دیا جائے گا، مگر یہ کہ عورت معاف کردے اور مقرر شدہ مہر کے آدھے حصے کو لینے سے دستبردار ہو جائے یا شوہر چشم پوشی کرتے ہوئے اُسے پورا مہر دے دے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالی بیان فرماتے ہیں کہ اگر زوجین میں سے کوئی ایک معافی دے دے، تو یہ معاف کرنے والے کو تقویٰ کے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔اس میں بڑا اجر ہے اور معاف کرنے والے کیلئے تقویٰ کی دلیل ہے اور اس میں یہ ہے کہ معافی مندوب ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے: ﴿**أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى**﴾ **"تقویٰ کے زیادہ قریب ہے"**، جس کا مطلب معافی دینے والے کی اللہ کی طرف سے مدح اور تحسین ہے،اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معافی نہ دینے پر سزا نہیں ہو گی، لہذا یہ مندوب ہونے کا قرینہ ہے، بالخصوص یہ کہ اللہ تعالی نے اس کے بعد ﴿**وَلاَ تَنسَوْا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ**﴾ **"اور آپس میں فراخ دلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو"**، کا ذکر کیا ہے، یعنی مسلمانوں کو ترغیب دی کہ ایک کی دوسرے پر فضیلت معافی دینے کی وجہ سے ہے۔

﴿**إِلاَّ أَنْ يَعْفُونَ**﴾ **"سوائے اس کے کہ وہ عورتیں رعایت کردیں"** یعنی مطلقہ عورتیں مہر معاف کردیں اور مقررہ مہر کے آدھے حصے سے دستبردار ہو کر چھوڑ دیں۔

﴿**أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ**﴾ **"یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے"** یعنی شوہر معاف کردیں،اور اپنی مطلقہ بیویوں کو آدھے کی بجائے پورا مہر دے دیں۔

ہم نے کہا کہ ﴿**الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ**﴾ **"جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے"** سے مراد شوہر ہے، سرپرست نہیں،اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

ا۔ اللہ سبحانہ وتعالی نے پہلے ذکر کیا کہ ﴿**فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ**﴾ "**جتنا مہر تم نے مقرر کیا تھا، اس کا آدھا دینا**" یعنی ایسی طلاق شدہ عورت جس کے ساتھ ہمبستری نہ کی گئی ہو، جبکہ اس کے لیے مہر طے کیا گیا ہو، تو اس کو آدھا مہر دیا جائے گا، اس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالی فرماتے ہیں ﴿**إِلاَّ أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ**﴾ "**سوائے اس کے کہ وہ عورتیں رعایت کردیں یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے**" اور اس کا مطلب ہے کہ جانبین میں سے ہر ایک کو مہر کے حوالے سے معافی کا حق حاصل ہے۔ جہاں تک پہلی جانب کی بات ہے تو وہ مطلقہ بیویاں ہیں، اس کا ذکر ﴿**إِلاَّ أَنْ يَعْفُونَ**﴾ "**سوائے اس کے کہ وہ عورتیں رعایت کردیں**" میں ہے۔ دوسری جانب وہ ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، یہ شوہر ہے کیونکہ عورت کے بعد وہی اکیلا وہ جانب ہے جو مہر کے موضوع میں معافی کا حق رکھتا ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ ایسی عورت کے لیے آدھا مہر ہے، مگر یہ کہ وہ درگزر کرے اور طلاق دینے والے مرد کے لیے یہ آدھا حصہ چھوڑ دے، یا طلاق دینے والا مرد اپنے بقایا نصف مہر کے حوالے سے درگزر کرے، یوں مطلقہ کو پورا مہر دیدے۔

ب۔ اور اللہ سبحانہ وتعالی نے عقد نکاح کے دونوں جانبین کو دیگر آیات میں بیان فرمایا ہے جنہیں مہر کے حوالے سے اختیار حاصل ہے ﴿**وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا**﴾ "**اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ خود اس کا کچھ حصہ خوش دلی سے چھوڑ دیں تو اسے خوشگواری اور مزے سے کھالو**" (النساء:4)۔ چنانچہ بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا مہر معاف کردے۔

اور اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿**وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلاَ تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا**﴾ "**اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور ان میں سے ایک کو ڈھیر سارا مہر دے چکے ہو، تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کرکے (مہر) واپس لوگے؟**" (النساء: 20)۔ یقیناً شوہر کی طرف مہر دینے کی نسبت کی گئی ہے، اور یہ کہ

جب وہ عورتوں کو طلاق دینا چاہیں تو وہ ان سے مہر نہ لیں۔ یعنی مہر کے معاملے میں میاں بیوی کو اختیارات دیے گئے ہیں، چنانچہ معاف کر دینے کا حق بھی ان میں سے کسی ایک کو حاصل ہے، ان کے علاوہ کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔

ج- اللہ تعالیٰ کا یہ قول ﴿أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ **"تقویٰ کے زیادہ قریب"** یعنی حقدار کی طرف سے معاف کر دینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اس کی طرف سے نہیں جو اس حق کا مالک نہیں۔ تو اگر معافی عورت کے ولی (سرپرست) کی طرف سے دی جائے تو ایسی معافی تقویٰ کے زیادہ قریب نہیں ہو گی، کیونکہ یہ کسی اور کے حق کی معافی ہے۔ اس طرح اگر ولی نے مہر معاف کر دیا جبکہ عورت کو یہ معافی منظور نہ ہو تو ولی کی معافی کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ مہر عورت کا حق اور ملک ہے، ولی کا نہیں، اس لیے ولی کی طرف سے معافی ﴿أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ **"تقویٰ کے زیادہ قریب"** نہیں ہو گی۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب اسی رائے پر مبنی ہے، یعنی یہ کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کے معاملے کا اختیار ہے وہ شوہر ہے، اسی طرح امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے۔

﴿وَلاَ تَنسَوْا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ **"اور آپس میں فراخ دلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو"**، یعنی ایک دوسرے پر مہربانی کرنا مت چھوڑو۔

پھر اللہ تعالیٰ آیت کریمہ کا اختتام فرماتے ہوئے انہیں یاد دہانی کراتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہر کام کو دیکھتے ہیں، سو وہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل پر جزا دے گا ﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ **"بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں"** کے یہی معنی ہیں۔

فہرست

اسلام میں نظریہ نسوانیت کا رد

خلیل مصعب - پاکستان

تعارف: نظریہ نسوانیت اور اسلام میں عورت کا مقام

جب بھی ہم نظریہ نسوانیت کے موضوع پر بحث کرتے ہیں اور یہ کہ اس کے بارے میں اسلام کا نکتہ نظر کیا ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دو بنیادی مسائل ایسے ہیں جن پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔ وہ بنیادی مسائل درج ذیل ہیں :

1۔ اسلام میں عورت کے مقام اور شریعت کی جانب سے اُن کے لیے مقرر کردہ کردار کے حوالے سے فہم کا شدید فقدان۔

2۔ خواتین کے حقوق کے حوالے سے ایک غلط فہمی اور ان حقوق کو برقرار رکھنے والے نظام کی عدم موجودگی۔

لہٰذا، نظریہ نسوانیت کے بارے میں اسلام کا موقف واضح کرنے کی کوئی بھی کوشش کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان دو مسائل پر توجہ دی جائے۔ ہمیں یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ اسلام کے خواتین کے بارے میں کیا احکامات ہیں، اسلام خواتین کو کن حقوق سے نوازتا ہے اور شریعت کی طرف سے ان پر کیا فرائض عائد کئے گئے ہیں۔ جب اس تمام کی وضاحت ہو جائے تو تب ہی ہم اسلامی شریعت کا نظریہ نسوانیت سے موازنہ کر سکتے ہیں اور اس حوالے سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آیا نظریہ نسوانیت اسلام سے کچھ مطابقت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ پس، ان شاءاللہ، ذیل میں اس کی وضاحت شروع کرتے ہیں۔

اسلام میں عورت کا مقام اور شریعت کے مطابق عورتوں کے فرائض

اسلام میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں کہ مرد و عورت ہر لحاظ سے سے برابر ہیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ دونوں انسان ہیں، اپنے خالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے۔ 'عبد' ہیں اور دونوں پر ہی اپنے پروردگار کی عبادت فرض ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات تو کسی بچے پر بھی واضح ہے کہ مرد و عورت دو مختلف جنس ہیں۔ وہ اس لیے ایسے ہیں کہ خالق کائنات نے ہی اُنہیں ایسے تخلیق کیا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی اس تفریق کی تصدیق کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ﴾ **"اور مرد، عورت کی مانند نہیں ہے"** (آلِ عمران:36)۔ مخلوط الجنس افراد کا وجود، جو کہ hermaphrodites کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں، اس حقیقت کی نفی نہیں کرتا کہ مرد اور عورت دو مخالف جنس ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قاعدے سے استثنیٰ ہونا، مطلق اصول کو منسوخ نہیں کرتا۔ درحقیقت، مطلق اصول کی وجہ سے ہی وہ استثنیٰ میسر ہوتا ہے۔ انسان پانچ اُنگلیوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ کچھ بچوں میں ایسے خلاف معمول واقعات بھی پائے جاتے ہیں جو کہ پانچ سے زیادہ یا کم اُنگلیوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی دو ہی جنس ہوتی ہیں اگرچہ چند افراد کی جنس مبہم ہو سکتی ہے۔ بے شک، ہم کسی مستثنیٰ افراد کے لیے گنجائش کرتے ہیں اور شریعت بھی مخلوط الجنس کے لیے یقیناً گنجائش رکھتی ہے۔ تاہم، یہ وہ موضوع نہیں جو کہ فی الحال یہاں زیر بحث ہے۔ جو موضوع یہاں زیرِ بحث ہے وہ اسلام میں خواتین کا مقام ہے۔ قرآن مجید واضح طور پر عورتوں کو ایک الگ جنس ہونے کے ناطے اُنہیں مردوں سے فرق کرتا ہے۔ پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ مرد و عورت کے درمیان مزید کیا تفریق رکھی جائے؟

جب ہم شریعت اور اُن فرائض کا معائنہ کرتے ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنین کو عنایت کیے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ معاملات میں تو بحیثیت انسان اور ان کی استطاعت کے مطابق شریعت نے مرد و عورت پر بالکل ایک جیسی ذمہ داریاں عائد کی ہیں جبکہ چند دیگر معاملات میں، مرد و عورت کی مختلف جنس کے طور پر، ان کی جنس اور استطاعت کے مطابق ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ اُن معاملات میں جہاں مرد و عورت دونوں پر ایک جیسے فرائض عائد ہیں، جن میں ہمارے پاس مثالیں ہیں کہ دونوں پر ہی دن میں پانچ دفعہ نماز ادا کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائیگی

فرض ہے۔ پھر شریعت کے کئی معاملات میں ایسے احکامات بھی موجود ہیں جہاں مرد و عورت پر علیحدہ ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ عبادات کے معاملے میں، مرد کے حوالے سے یہ مثال ہے کہ مرد پر اجتماع کے ساتھ جمعہ کی نماز کی ادائیگی فرض ہے جبکہ عورت پر نہیں۔ مناکحات کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ مرد پر اپنی زوجہ کا سرپرست ہونے کی ذمہ داری ہے اور بیوی کیلیے یہ ہدایات ہیں کہ وہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرے۔

پس اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مؤمنین مرد و عورت کے فرائض کچھ معاملات میں تو ایک جیسے ہیں اور کچھ معاملات میں مختلف ہیں۔ اور یہ ذمہ داریاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہی عائد کردہ ہیں اور ہم پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندے ہوتے ہوئے اپنی بھرپور استطاعت کے مطابق ان فرائض کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سب سے زیادہ حکمت والا، سب سے زیادہ عادل ہے اور ہمیں صرف اُسی کے حکم کا فرمانبردار رہنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: **﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ "ایمان والوں کی بات یہی ہے، جب ان میں فیصلہ کرنے کو اُنہیں اللہ اور رسول کی طرف بلائیں،، تو کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور مانا اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"** (النور: 51)۔

اسلام میں خواتین کے حقوق اور ایک نظام جو ان حقوق کی حفاظت کرتا ہے

جس طرح ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ شریعت ہی ہے جو مؤمنین کے فرائض اور ذمہ داریاں طے کرتی ہے، اُسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مؤمنین کے حقوق بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شریعتِ مبارکہ سے ہی اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بندے کے حقوق اُسے اس کے آقا کی طرف سے ہی عطا کیے جاتے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہمارے آقا ہیں اور ہم اُن کے تابعدار بندے ہیں۔ اسی لیے، یہ جاننے کے لیے کہ اسلام میں خواتین کو کیا حقوق دئے گئے ہیں، ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحیٔ مبارکہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو ہمیں قرآن کریم اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ سے

ملتی ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں، ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴾ " اے ایمان والو! اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اہلِ امر (حکمرانوں) کی بھی اور اگر تم کسی معاملے میں تنازعہ کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹادو، اگر تم اللہ پر اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہو، یہی بہتر اور احسن حل ہے "(النسآ: 59)۔ بہر حال مسئلہ یہ نہیں ہے کہ شریعت نے خواتین کو حقوق عطا نہیں کیے بلکہ آج امت میں مسئلہ تو یہ ہے کہ زمانۂ حال میں خواتین کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔اور یہاں تو ہم ایک بہت ہی بڑے مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

شریعت کا نفاذ اور خلافت کی غیر موجودگی

یہ 1924 کی بات ہے کہ مغربی ایجنٹ، مصطفیٰ کمال سائیک پیکوٹ معاہدے کے تحت عثمانی خلافت کو تاراج کرنے میں کامیاب ہو گیا، مغربی طاقتوں نے مسلمان علاقوں کے حصے بخرے کر ڈالے اور آپس میں تقسیم کر لیے۔اُن معاشروں میں جہاں مسلمان آباد تھے، کوششیں کی گئیں کہ شریعت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے۔ان علاقوں میں جو قوانین رائج تھے انہیں شریعت سے بدل کر مغربی قوانین اختیار کر لیے گئے۔ شرعی عدالتوں کے اختیارات پہلے تو محدود کر دیئے گئے پھر انہیں بالکل ہی ختم کر دیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں اس طرح نئی اصلاحات کی گئیں تا آنکہ لوگ پھر دوبارہ اپنے دین سے کچھ نہ سیکھ سکیں بلکہ اس کی بجائے لوگ مغرب کا نصابِ تعلیم سیکھیں۔ حتیٰ کہ معاشرے میں ہر جگہ اور ہر پہلو سے استعمار کی جانب سے شریعت کو نشانہ بنایا گیا اور اسے بزورِ طاقت اُکھاڑ کر باہر پھینک دیا گیا۔اِن تمام کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُمت اَن گنت مصائب میں گھر کر رہ گئی۔ ریاستِ خلافت کی عدم موجودگی سے، کہ جو لوگوں پر خَیر کو مقدم رکھتی تھی اور شریعت کا نفاذ کرتی تھی، مسلمان دنیا کرپشن اور ناانصافی کے ہر طرح کے مسائل سے دوچار ہوتی چلی گئی۔اور خواتین کے معاملے میں یہ ناانصافی نہ صرف بے انتہا بلکہ شدید تھی جو کہ ابھی تک موجود ہے۔ جبری

شادیاں، عورت کو طلاق کا حق نہ دینااور غیر قانونی طریقے سے بیوی کی دولت خرچ کر دینا وغیرہ، عورتوں کے شوہروں یامرد رشتہ داروں کے دائرۂ اختیار میں تھا، یہ سب معاشرے میں پھیلی اور مشہور مثالوں میں سے محض چند مثالیں ہیں۔

خواتین سے ہونے والی ناانصافیاں مزید بڑھ کر تب ظاہر ہوئیں جب دین کو جانتے بوجھتے ہوئے تروڑ مروڑ کر رکھ دیا گیااور دین کو اس مقصد کے لیے جواز کے طور پر استعمال کیا گیا۔اس طرح اسلام کا یہ حکم کہ ایک عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت کرے،اس حکم کو اس کے خاوند کے ایسے رویے کو جواز دینے کے طور پر استعمال کیا گیا کہ جب وہ اپنی بیوی سے بد تمیزی کرے یا اس کے حقوق ادا کرنے میں ناکام ہو جائے اور اسی طرح اسلام کے اس حکم کو کہ اگر عورت کے پاس کوئی معقول وجہ نہ ہو اور وہ اپنے خاوند سے ہمبستری سے انکار کرے تو اس صورت میں وہ عورت گنہگار ہو گی، خاوند کی طرف سے اپنی بیوی کے ساتھ ہر طرح کی بیہودگی کے جواز کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ہمیں ایسے واقعات بھی سُننے کو ملتے ہیں کہ جب کوئی مرد کسی عورت سے زبردستی زنا کر لیتا ہے، جو کہ اس کی بیوی نہیں ہے تو پھر اسے سزا سے بچانے کے لیے عورت کو اُسی مرد سے شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ایسے واقعات ایسے افسوسناک حالات کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں آج امت پِس رہی ہے۔ خلافت کی عدم موجودگی میں کوئی ایسا نظام موجود نہیں ہے جو لوگوں کو اپنے دین کی جامع تفصیلات سے رُوشناس کر سکے، لوگوں میں اچھے برتاؤ اور تقوٰی و پرہیزگاری کی حوصلہ افزائی کر سکے اور ان میں موجود مجرموں کی کَڑی پکڑ کر سکے۔ آج یہ صرف خواتین کے حقوق ہی نہیں ہیں جو محفوظ نہیں بلکہ ہر جگہ ہر کسی کے حقوق ہی پامال ہو رہے ہیں۔

نظریہ نسوانیت کوئی حل نہیں ہے

نظریہ نسوانیت کی اس بحث میں یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ خلافت کی عدم موجودگی اور شریعت کا نفاذ نہ ہونا ہی اس امت میں خواتین کے ساتھ ناانصافی ہونے کی حقیقی وجوہات ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اب امت کے کچھ طبقات میں یہ رائے زور پکڑتی جا رہی ہے کہ نظریہ نسوانیت کا پرچار کرنا ہی خواتین کے حقوق حاصل کرنے کا درست

طریقہ ہے۔ تاہم، اس اُمت کے ماننے والوں کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ نظریہ نسوانیت کوئی منہج (طریقہ کار) نہیں ہے بلکہ یہ ایک نظریہ ہے جو مغرب میں تشکیل شُدہ کُفریہ تصورات پر مبنی ہے۔ اس نظریے کا مکمل فہم حاصل کرنے کیلیے نظریہ نسوانیت کی مغربی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔

مغرب میں نظریہ نسوانیت کا ظہور اور اس میں موجود کفر

یہ تصور کہ عورت فطری طور پر مرد سے کمتر ہے، ایک ایسا خیال تھا جو قدیم یونانی فلسفیوں کے دور سے جا ملتا ہے۔ ارسطو کا مشہور مقولہ ہے کہ "عورت کا مرد سے موازنہ ایسا ہی ہے جیسے ایک غلام کا اپنے مالک سے، کسی مزدور کا کسی تحقیقی کام کرنے والے سے، کسی جنگلی اُجڈ کا ایک یونانی سے۔ عورت ایک نامکمل مرد ہوتی ہے، جو کہ تخلیق کے معیار میں نچلے درجے پر ہوتی ہے"۔ بعد میں جب عیسائیوں نے یورپ کا اقتدار سنبھالا تو عورتوں کے متعلق ان کے تصورات بھی عورتوں کے حق میں نہ تھے۔ حضرت حوا سے متعلق بائبل کی کہانی کہ ایک ناگ نے اُنہیں دھوکے سے ایک سیب کھانے کو دیا اور پھر اس کا کچھ حصہ آدم کو دینے کو کہا، اور اس کے نتیجے میں دونوں کو بہشت سے بے دخل کر دیا گیا، اس کہانی سے مغربی ثقافت میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ عورت فکری طور پر مرد سے کم تر ہے، مصیبت میں ڈالنے والی ہے، اور مرد کے لیے ایک زحمت ہے۔ یہی وہ تصورات تھے جنہوں نے صدیوں تک مغربی معاشروں میں عورتوں سے بد سلوکی اور ظلم و جبر رَوا رکھے۔ انہیں طلاق کا حق نہ دیا گیا اور اس اعتقاد کی وجہ سے کہ عورت غیر ذمہ دار اور نامعقول ہوتی ہے، انہیں اُن کی اپنی ہی جائیداد کا انتظام سنبھالنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے بجائے، ایک بیوی کی جائیداد اس کے خاوند کی جائیداد بن جاتی اور وہ جہاں بھی چاہتا، اسے خرچ کر سکتا تھا جبکہ اس عورت کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ یورپ کی نام نہاد نشاۃِ ثانیہ سے سات صدیاں قبل ہی یہ دونوں طرح کے حقوق، یعنی عورت کو طلاق کا حق اور جائیداد کا مالک ہونے اور اسے اپنی ملکیت میں رکھنے کا حق، ہمارے پیارے رسول محمد ﷺ عورتوں کو عطا کر چکے تھے۔ عیسائیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ حوّا نے آدمؑ کو سیب کا ایک ٹکڑا کھانے پر قائل کر لیا، اور اس سے یہ بھی اعتقاد رکھتے تھے کہ جب بھی عورت کو بولنے کی اجازت دی گئی، اس کا نتیجہ کسی خرابی کی صورت میں ہی نکلا، لہٰذا اس سے بہتر ہے

کہ عورت کو خاموش ہی رکھا جائے۔ قُرونِ وسطیٰ کے دور میں بہت سے یورپی ممالک میں، جو عورتیں اجازت سے زیادہ بولتی تھیں یا جنہوں نے اپنے خاوندوں کو ناراض کیا ہوتا تو اُن عورتوں کے منہ پر ایک آہنی شکنجہ نُما آلہ لگا دیا جاتا تھا۔

اتنی توہین اور بدسلوکی سے صدیاں گزر جانے کے بعد مغرب کی عورت نے اپنے آپ کو منظم کیا اور اپنے لیے بہتر حقوق کا کھلم کھلا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ یوں اس طرح، اُنیسویں صدی میں حقوقِ نسواں کی پہلی تحریک شروع ہوئی جس کی تعریف یوں تھی کہ مغربی عورتوں کی اپنے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے کوشش، جیسے کہ ووٹ کا حق دینا اور ملکیت کا حق دینا وغیرہ۔ البتہ، یہ حقوق فراہم کر دینے کے باوجود ابھی بھی مغرب میں ایسے تصورات کثرت سے غالب تھے جو کہ لوگ اپنی عورتوں پر ظلم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اُن تصورات میں سے ایک مثال، مغربی فلسفہ "حیاتیاتی نظریۂ جبریت"(biological determinism) ہے۔ مغربی مفکرین کا یہ خیال تھا کہ معاشرے میں مرد و عورت کے کردار اُن کی حیاتیاتی ساخت کے مطابق طے ہونے چاہئیں۔ ان کی حیاتیاتی ساخت، ظاہر ہے، انہیں ایک دوسرے سے بنیادی طور پر جُدا کرتی ہے۔ اس تصور کا ادراک، کہ ایک مرد اور ایک عورت دو الگ الگ حیاتیاتی اجسام ہیں، ہمارے دین میں بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ اس موضوع کے بالکل آغاز میں ہی اس کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ تاہم، مغربی کفار جس غلطی پر ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے صنف کے کردار متعین کرنے میں شریعت کے بجائے عقلی استدلال کو بنیاد بنا دیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عقلی توجیہ غلطی سے مبرّا نہیں ہوتی اور اس میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ بہر حال مغرب میں اس کج رَوی نے عورتوں کے متعلق ہر طرح کے گُمراہ کن خیالات کو ترویج دی۔ مثال کے طور پر، اُنیسویں صدی میں مغربی ڈاکٹر اس سوچ تک جا پہنچے کہ عورت کا جسم ایک "مجتمع مرکب (anabolic) ہوتا ہے یعنی یہ توانائی کو صَرف کرنے کی بجائے توانائی کو ذخیرہ کرتا ہے۔ انہوں نے اس بنیاد پر یہ کہا کہ اس سے عورتیں سُست اور کاہل ہو جاتی ہیں اور اس طرح وہ سیاست کے میدان کے لیے نااہل اور غیر موزوں ہیں۔ ایسے تصورات کو پھر عورتوں کو حقِ رائے دہی سے محروم کرنے اور اُنہیں سیاست سے علیٰحدہ رکھنے کے جواز کے طور استعمال کیا گیا۔ یہاں پر عمرؓ کی اس مثال کا ذکر کرنا شاید سُود مند ہو گا، جب ایک عورت نے حق مہر کے معاملہ پر اُن کی

تصحیح کی۔ ناقص عقل پر مبنی یہ تصور یعنی "حیاتیاتی نظریۂ جبریت"(biological determinism) ہی تھا جس نے نظریہ نسوانیت کی تحریک کی دوسری لہر کو جنم دیا۔ نظریہ نسوانیت کی فلسفہ نگار جیسے Simone de Beauvoir اور Betty Friedan نے اس خیال کی مخالفت شروع کر دی کہ حیاتیاتی ساخت کسی عورت کے معاشرے میں کردار کا تعین کر سکتی ہے اور اُنہوں نے اس خیال کو پروان چڑھانا شروع کر دیا کہ معاشرے میں اپنے طرز عمل کے حوالے سے ایک عورت، مرد کے برابر ہو سکتی ہے۔

نظریہ نسوانیت کے علمبرداروں کی جانب سے حیاتیاتی نظریۂ جبریت کی پابندیوں سے عورت کو آزادی دلانے کی اِن کوششوں کے غیر مطلوبہ نتائج نکلے۔ جُوں جُوں نظریہ نسوانیت کی سوچ بڑھتی چلی گئی اور نسوانیت کی تیسری اور چوتھی لہر بھی شروع ہو گئی، تو مفکرین جیسے جوڈتھ بٹلر Judith Butler نے نسوانیت کے دوسرے دور کی علمبرداروں مثلاً Simone de Beauvoir کے خیالات کو ایک نئی انتہا دے دی۔ اب یہ بھی کہا جانا شروع ہو گیا کہ نہ صرف معاشرے میں عورت کے کردار کا تعین اس کے حیاتیاتی خدوخال سے نہیں ہونا چاہئے بلکہ عورت کی جنس کا تعین بھی اس کی جسمانی ساخت سے طے نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تصور کہ جِنس محض ایک سماجی برتاؤ ہوتا ہے اور یہ کہ ایک عورت صرف اپنے جسمانی خدوخال کی وجہ سے عورت نہیں ہوتی، اس تصور نے ہی ٹرانسجنڈر تحریک کو ہَوا دی۔ اب مغرب میں یہ خیال ہر طرف پھیلا ہوا ہے کہ ایک مرد و عورت اپنے لیے اپنی جنس کا انتخاب خود کر سکتے ہیں۔ ایک مرد وِگ لگا کر اور ایک سکرٹ پہن کر اپنے آپ کو ایک عورت کہلوا سکتا ہے۔ یہ ایک اور قبیح گناہ ہے، کیونکہ ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ **« لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم الْمُتَشَبِّهَاتِ بِالرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهِينَ بِالنِّسَاءِ مِنَ الرِّجَالِ »** **"اللہ کے نبی ﷺ نے اُن مردوں پر لعنت کی جو عورتوں کی مشابہت کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر لعنت کی جو مردوں کی مشابہت کرتی ہیں"** (ترمذی)۔ پس اس طرح یہاں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح ایک کفر کو اپنا لینا مزید کفر کی طرف لے جاتا گیا۔ مغرب میں عورتوں کی اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے "روشن خیالی" کی اس جدوجہد نے اس بنیادی تصور کا شیرازہ بکھیر دیا جو تصور عورت ہونے کی بنیادی

حقیقت کی تعریف کرتا ہے۔ یہ مؤمنین کے لیے ایک تنبیہ ہے۔ ہمارے پیش رَو صالحین بھی اُمت کو خبر دار کرتے رہے کہ جس طرح ایک نیک عمل کی ادائیگی کا صلہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دوسرے نیک عمل کی توفیق دیتے ہیں، اُسی طرح بُرا فعل کرنے کی سزا یہ ہے کہ وہ شخص مزید بُرے افعال میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مومن قرآن وسُنت کے احکامات سے کنارہ کشی کرتا ہے اور وہ ایسے نظریات اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے جو کہ کُفریہ ہیں تو وہ اُن میں کوئی حد نہیں پاتا۔ وہ گناہوں کی دلدل میں ڈوبتا چلا جاتا ہے جہاں سے واپسی کا واحد راستہ یہی ہے کہ شریعت کی طرف دوبارہ رجوع کیا جائے۔

اس کی مزید وضاحت، نظریہ نسوانیت کی تحریک میں سوشلزم کے شامل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب تحریک نظریہ نسوانیت کے خیالات کی پہلی لڑی نمودار ہوئی تو اس میں نہایت سُرعت کے ساتھ سوشلسٹ فلسفہ سرایت کر گیا۔ یہ فریڈرک اینجل Friedrich Engels جیسے سوشلسٹ مفکرین ہی تھے جنہوں نے شادی کی تعریف مرد وعورت کے مابین طبقاتی کشمکش کے طور پر کی، بالکل اُسی طرح جیسے معاشرے کے ادنیٰ طبقے اور متوسط طبقہ میں طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے۔ اس طرح اس تعریف نے شادی کے بندھن کی بنا پر بنے معاشرے کی اقدار کو مجروح کر دیا۔ بعد ازاں، بیسویں صدی میں، Simone de Beauvoir نے سوشلسٹ نظریات پر مبنی طبقاتی کشمکش تشکیل دی اور بالآخر یہ طے کیا کہ مرد وعورت معاشرے کے تنازعات میں ملوث ہوتے ہیں۔ اس تصور کے برعکس، اسلامی فہم یہ ہے کہ مرد وعورت ایک دوسرے کے مددگار (**أَوْلِيَاءُ**) ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ **وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ** ﴾ **"اور ایمان والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں"** (التوبہ: 71)۔

مرد وعورت کے ایک دوسرے کے خلاف تنازعہ کرنے سے سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ذرا غور کریں کہ آخر کیسے مغرب میں نظریہ نسوانیت کے غالب ہونے کے باوجود طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے اور ان بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو ان تنہا ماؤں کے رحم وکرم پر پَل رہے ہیں جو خود بیچاریاں کمانے کے لیے کام کرنے پر

بھی مجبور ہیں۔ یہ تباہی صرف نظریہ نسوانیت کی ہی مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ اس میں بڑھتے ہوئے نظریہ لذت کی تلاش (hedonism) اور نظریہ انفرادیت (individualism) کا بھی اتنا ہی کردار ہے۔ لوگ شادی کو یا خاندانی نظام کو اب مزید اہمیت ہی نہیں دیتے اور اس کی بجائے عارضی تسکین اور تجربہ کی تلاش میں رہتے ہیں جو اُن کی انفرادیت کی سوچ کو مزید تقویت دیتا ہے۔ اس طرح، مغرب میں صرف چند لوگ ہی شادی کر پاتے ہیں، زنا کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے، بچوں کی پیدائش میں کمی واقع ہو رہی ہے، اسقاطِ حمل کی تعداد عروج پر ہے اور زنا میں لُتھڑی ایسی آبادیوں کی وجہ سے جنسی طور پر منتقل ہونے والی بیماریاں بھی انتہا پر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے نظریات کا بہت احتیاط سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ اگر کچھ عمومی سطح پر بے ضرر بھی نظر آ رہا ہو تو بھی وہ اُمت کی تباہی کا سبب ہو سکتا ہے۔ نظریہ نسوانیت کو مؤمنین کو اس طرح پیش کیا گیا کہ جیسے یہ خواتین کے حقوق کی ضمانت کا ایک طریقہ ہے لیکن اس کی بنیادیں کُفر اور گلی سڑی ہونے کے سوا کچھ نہیں۔

خواتین کے حقوق اور استعماری ایجنڈا

نظریہ نسوانیت سے متعلق ایک اور نکتہ بھی ہے جس کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلم علاقوں میں مغرب کی جانب سے نسوانیت کا نظریہ عورتوں کی آزادی کے لیے کسی خلوصِ نیت سے نہیں پیش کیا گیا۔ بلکہ یہ شریعت کو نیچا دکھانے اور مسلمانوں پر غلبہ کی استعماری مہم کو آگے بڑھانے کے طور پر پیش کیا گیا۔ جب استعمار مسلم دنیا میں داخل ہوئے تو انہوں نے شریعت کو اُکھاڑ پھینکنے اور اسے اپنے قانونی نظام سے بدلنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے۔ ایسا کرنے کے لیے اُن کے ذرائع میں ایک مستشرقین منصوبے کی معاونت کرنا بھی تھا؛ یورپی اداروں نے ایسے تعلیمی وفود پیدا کرنا شروع کر دیئے جنہوں نے شریعت کا گہرائی سے مطالعہ کر رکھا تھا اور انہوں نے شریعت کی تعلیمات مسخ کرنا اور اس کے متعلق جھوٹ پھیلانا شروع کر دیا۔ مستشرقین کی طرف سے پھیلائے گئے سب سے زیادہ تباہ کن بیانات میں سے ایک یہ تھا کہ شریعت ایک سخت گیر نظام تھا جس سے معاشرے میں جمود کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ یورپ کے لوگ اپنے آپ کو تبدیلی اور ترقی کا علمبردار سمجھتے تھے اور ان کا دعوٰی تھا کہ قانون سے متعلق اُن کے تعلیمی

ادارے شریعت سے بَر تر تھے۔ اُن کا دعوٰی تھا کہ شریعت پُرانی ہو چکی ہے اور جدید دنیا سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس پر استدلال کرتے ہوئے وہ جو دلائل استعمال کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ دعوٰی تھا کہ شریعت نے عورت پر ظُلم رَوا رکھا اور انہیں اُن کے حقوق نہیں دیئے گئے۔ اس بیانیہ کو تقویت دینے کے لیے، مستشرقین نے جانتے بوجھتے ہوئے شریعت کی غلط تشریح کی اور مسلمانوں کے متعلق جھوٹ پھیلا دیئے۔

پس مثال کے طور پر، جب یورپ کے لوگ ترکی میں آئے تو انہوں نے عثمانی سلطان کے حرم کے بارے میں جانا۔ حرم بنیادی طور پر عثمانی محل کی خواتین کی رہائش کے لیے وقف تھا اور اس کے ساتھ ہی یہاں خواتین کو تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ کسی مرد کو حرم میں داخلے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ یورپی مرد یہ جان کر بہت مایوس ہوئے اور انہوں نے حرم کے متعلق گھٹیا جھوٹ گھڑنے اور پھیلانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے دعوٰی کرنا شروع کر دیا کہ حرم سلطان کی باندیوں کے لیے ایک قید خانہ ہے اور یہ کہ اُن باندیوں کو کچھ کام نہیں دیا جاتا کیونکہ وہ سارا دن انتظار کرتی رہتی ہیں کہ کب سلطان انہیں بُلوا دیں۔ اس من گھڑت کو سچ میں بدلنے کے لیے، ان مستشرقین نے واپس اپنے گھر یورپ میں فلموں کے سیٹ تشکیل دیئے جو اس طرح ڈیزائن کئے گئے تھے کہ عثمانی حرم کی نقّالی کرتے تھے اور پھر ایسی اداکارائیں اُجرت پر رکھیں جن کے نقش و رنگت مشرقی خواتین سے میل کھاتے تھے۔ اداکاراؤں کو یہ ہدایات تھیں کہ وہ بیزار اور مایوس نظر آئیں۔ پھر اُن اداکاراؤں کی تصاویر لی گئیں اور اُن تصاویر کو شریعت اور مسلمانوں کے خلاف رائے عامہ بنانے کے لیے پورے یورپ میں پھیلا دیا گیا۔ اُنہوں نے اس پر ہی اکتفانہ کیا بلکہ انہوں نے اندرونِ حرم کی ایسی نقاشی گری کی کہ ان تصویر نگاری میں حرم کی خواتین کو عُریاں دکھایا گیا تھا، پس اس طرح ایک ایسی مکمل تہذیب بیان کی جس میں یورپ کی طرف سے مسلمان خواتین پر جنسی حملہ کیا گیا تھا۔ پورے یورپ میں وسیع پیمانے پر ایسی فحش تصاویر پھیلائی گئیں، جن میں مسلمان خواتین کی اداکاری کرتی ہوئی اداکارائیں نظر آتی تھیں۔

مسلمان خواتین کے متعلق یورپ کے اس جنون نے اُن کی حد درجہ خباثت ظاہر کر دی۔ الجیریا میں، فرانس نے مسلمان خواتین کو اپنے حجاب اُتارنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک مہم کا آغاز کیا۔ فرانسیسی، اپنی عورتوں کو

مسلمانوں جیسا لباس اور نقاب اوڑھا دیتے تھے اور پھر اُنہیں کسی عوامی جگہ پر یوں کھڑا کر دیتے تھے کہ وہ مسلمان دکھائی دیں اور پھر وہ اپنے نقاب اُتار دیتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح کرنے سے مسلمان خواتین متاثر ہو کر اپنے حجاب پہننا ترک کر دیں گی۔ یہ کاوشیں ناکام ثابت ہوئیں اور الجزائر میں فرانس کے خلاف ہونے والے انقلاب میں حجاب ہی مسلمانوں کی آزادی کی علامت بن گیا۔ مسلمان خواتین سے اپنے حجاب چُھڑوا دینے کی یہ استعماری مہم اُن کے مسلمانوں پر غالب ہونے کے منصوبہ کا ہی ایک حصہ تھی۔ Frantz Fanon اپنے نظریے کو "الجزائر کی نقاب کشائی" میں بیان کرتا ہے کہ: "اگر ہم الجزائر کے معاشرے کا نظام اور اس کی مزاحمت کی استطاعت تباہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے ان کی عورتوں کو زیر کرنا ہوگا؛ ہمیں چاہئے کہ ہم جائیں اور انہیں پردہ کے پیچھے سے جہاں وہ اپنے آپ کو چھپاتی ہیں اور اُن کے گھروں میں اُنہیں ڈھونڈیں جہاں اُن کے مرد انہیں نظروں سے دور رکھتے ہیں"۔ وہ اس کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "یہ بات یقینی تھی کہ الجزائر کے لوگ نہ ڈگمگائیں گے بلکہ وہ تب تک اپنے قابض کی طرف سے ہونے والی ثقافتی یلغار کی مزاحمت اور اس انضمام کی مخالفت کرتے رہیں گے جب تک کہ ان کی عورتیں اسے پلٹ نہ دیں۔ اس استعماری پروگرام میں یہ عورت ہی تھی جسے الجزائری مرد کو ہلا کر رکھ دینے کا تاریخی مشن سونپا گیا تھا۔ عورت کو بدل کر رکھ دینا، بیرونی مغربی اقدار سے اس کا دل جیت لینا، اسے اس کے مقام سے آزاد کرانے کی جدوجہد، یہ وہ اقدامات تھے جن کے ذریعے اصل مقصد مردوں پر حقیقی اقتدار حاصل کرنا اور الجزائر کی ثقافت کو عملی اور مؤثر طریقے سے تباہ کرنا تھا"۔

اسی طرح مصر میں برطانیہ کی طرف سے نامزد کیے گئے کنٹرولر جنرل Evelyn Baring نے حجاب کے خلاف اُسی طرز پر اَن گنت مہمات کا آغاز کیا جس طرح فرانس نے الجزائر میں شروع کیا تھا۔ تاہم، اُس دوران میں جب وہ حجاب اوڑھنے کو عورت پر ظلم گردانتے ہوئے حجاب پر تنقید کر رہا تھا، تو اُسی دور میں وہ اپنے ملک میں عورتوں کے حقِ رائے دہی کے خلاف مردوں کی لیگ کا پہلا صدر ہونے کی ذمہ داری بھی ادا کر رہا تھا۔ Baring کی جانب سے اس کھلم کھلا منافقت کا مظاہرہ ہم پر یہ آشکار کرنے کے لیے کافی ہے کہ استعمار کے درپردہ مقاصد کیا تھے۔ مسلمان عورتوں

کی "آزادی" سے انہیں کوئی غرض نہ تھی بلکہ اُن کا مقصد پہلے تو شریعت کو بدنام کرنا اور پھر بطور ضابطۂ اخلاق، شریعت کا خاتمہ کرنا تھا۔

نتیجہ:

یہ مضمون پڑھنے والے کو اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ نظریہ نسوانیت کے حوالے سے اسلام کا نکتۂ نظر کیا ہے۔ چونکہ اسلام، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ دینِ کامل ہے، نسوانیت کا نظریہ انسان کے خود ساختہ نظریات کے سوا کچھ نہیں جو کہ کفر کی بنیاد پر اُستوار ہے۔ یہ نہایت بد نصیبی کی بات ہے کہ خلافت کی غیر موجودگی میں امت اپنے دین کی تمام برکتیں حاصل کرنے سے بھی محروم ہے اور نتیجتاً اپنے معاملاتِ زندگی کو منظم کرنے کے لیے کفریہ نظریات کی طرف رُخ کرتی ہے۔ اسی لیے خلافت کے دوبارہ قیام کے لیے کام کرنے کی اہمیت ہم پر بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ صرف نبوت کے نقشِ قدم پر قائم خلافت کی بحالی سے ہی شریعت کا نفاذ ممکن ہے اور صرف اسی طرح خواتین کے حقوق کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ تو آئیں ان شاءاللہ اس نیک مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ** ﴾ **"اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اللہ انہیں زمین پر حکمرانی عطا فرمائیگا جیسے اس نے اُن سے پہلوں کو حکمرانی دی تھی اور ان کے لیے ان کا دین جما دے گا جو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدلے دے گا تاکہ وہ صرف میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور اس کے بعد جو کوئی نافرمانی کرے گا سو وہی لوگ فاسق ہیں"** (النور: 55)

فہرست

اسلامی خلافت ایک منفرد حکومتی نظام ہے

حزب التحریر کی کتاب "ریاستِ خلافت کی حکومتی اور انتظامی تنظیم" سے ماخوذ

یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت یعنی خلافت، اپنی مخصوص شکل و ہیئت کے اعتبار سے دنیا کے موجودہ تمام حکومتی نظاموں سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے؛ خواہ اُس بنیاد کے لحاظ سے جس پر یہ نظام قائم ہے؛ یا اپنے مخصوص افکار، مفاہیم و تصورات، معیار و پیمانے اور احکام کے اعتبار سے، کہ جن کے ذریعے اِس نظام میں امور اور معاملات کی نگہداشت ہوتی ہے؛ یا پھر اپنے آئین اور قوانین کے اعتبار سے جو نافذ کئے جاتے ہیں؛ یا پھر اپنی خاص شکل کے لحاظ سے جو ریاستِ خلافت کی ہوتی ہے اور یہ شکل وہئیت پوری دنیا کے تمام دیگر نظام ہائے حکومت سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خلافت کوئی بادشاہت کا نظام نہیں ہے، اور نہ ہی یہ اُس سے مطابقت یا مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ بادشاہت میں بادشاہ کا بیٹا اُس کے بعد اقتدار کا وارث ہوتا ہے اور اس میں لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نظامِ خلافت میں حکمرانی میں وراثت نہیں ہوتی بلکہ امت کا بیعت دینا ہی خلیفہ کے نصب کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ پھر بادشاہت کے نظام میں بادشاہ کو ایسے امتیازی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو اُس کے سوا، رعیت میں سے کسی اور فرد کو حاصل نہیں ہوتے اور یہ امتیازات بادشاہ کو قانون سے بالاتر بناتے ہیں، نیز بادشاہ کے نام سے ملک پہچانا جاتا ہے۔ بعض نظاموں میں بادشاہ کا وجود تو ہوتا ہے لیکن وہ حکومت نہیں کرتا، اور بعض نظاموں میں بادشاہ کو مکمل تصرف حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے ملک اور عوام پر حکومت کرتا ہے اور اُس کی ذات کو چھوا بھی نہیں جا سکتا خواہ وہ کتنا بھی ظلم کرے یا بُرا سلوک کرے۔ جبکہ نظامِ خلافت میں خلیفہ کو رعایا سے کسی بھی طرح کی فوقیت حاصل نہیں ہوتی جیسی کہ بادشاہ کو بادشاہت کے نظام میں حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی عدالتی معاملات میں کوئی ایسے امتیازی حقوق حاصل ہوتے

ہیں کہ وہ عوام سے کسی بھی طرح ممتاز یا بالا تر ہو؛ نیز بادشاہت کے نظام کے بر خلاف خلیفہ اِس ریاست کی علامت بھی نہیں ہوتا۔ خلیفہ حکومت و اقتدار کے معاملہ میں امت کا نائب ہوتا ہے، جسے امت منتخب کرتی ہے اور اپنی مرضی کے ساتھ اسے بیعت دیتی ہے تاکہ خلیفہ امت پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کا نفاذ کرے۔ نیز خلیفہ اپنے تمام تصرفات اور احکامات اور عوام کے معاملات اور مفادات (مصالح) کی دیکھ بھال میں شریعت کے احکامات کا پابند ہوتا ہے۔

خلافت کوئی نوآبادیاتی طرز کا نظام نہیں ہے، کیونکہ نوآبادیاتی شہنشاہی نظام اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ جن علاقوں پر اسلام کے مطابق حکمرانی کی جاتی ہے وہاں مختلف رنگ و نسل کے لوگ اور تمام علاقے ایک ہی مرکز سے منسلک ہوتے ہیں؛ اور یہ حکمرانی نوآبادیات کی طرح نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس ہوتی ہے کیونکہ نوآبادیاتی نظام میں مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کو برابری کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ حکومتی، مالیاتی اور اقتصادی امور میں مرکز نوآبادی (کالونی) کے ساتھ امتیازی سلوک برتتا ہے۔

جبکہ حکمرانی میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ ریاست کے تمام علاقوں میں اپنے شہریوں کے ساتھ، رنگ و نسل کے فرق سے بالا تر ہو کر مساویانہ سلوک کیا جائے۔ اسلام قومیت کے تصور کو مسترد کرتا ہے۔ وہ ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو انکے پورے پورے حقوق و واجبات احکامِ شریعہ کے مطابق عطا کرتا ہے۔ وہ اسی انصاف سے استفادہ حاصل کرتے ہیں جو مسلمانوں کو مہیا ہوتا ہے اور مسلمانوں ہی کی طرح ان کا محاسبہ بھی کیا جاتا ہے۔ کسی بھی عدالت میں رعایا کے کسی بھی فرد کو، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو، کوئی ایسے امتیازی حقوق حاصل نہیں ہوتے جو کسی اور شہری کو حاصل نہ ہوں، خواہ وہ مسلم ہی ہو۔ اس مساواتی سلوک کے وجہ سے خلافت کا نظام شہنشاہیت سے مختلف ہوتا ہے، اس میں مختلف علاقوں یا صوبوں کی حیثیت شہنشاہیت کی طرح نوآبادیات (colonies) کی نہیں ہوتی جن کا استحصال کیا جاتا ہو اور نہ ہی انہیں ایسے چشموں کی مانند سمجھا جاتا ہے جن سے مرکز کی سیرابی مقصود ہو۔ خلافت تمام علاقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے، خواہ ان کے درمیان کتنا ہی فاصلہ ہو اور ان میں کتنے ہی رنگ و نسل کے لوگ آباد ہوں، ان میں سے ہر علاقہ اُس ریاست کے جسم کے ایک عضو کی مانند ہوتا ہے۔ اِن علاقوں میں لوگوں کو وہی حقوق و مراعات حاصل

ہوتی ہیں جو مرکز کے عوام یا کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کو میسر ہوں۔ نیز حکومت کا اقتدار، نظام اور قانون تمام علاقوں کیلئے یکساں ہوتا ہے۔

خلافت کوئی وفاقی (فیڈرل) نظام نہیں ہے، جہاں مختلف علاقے اپنی مقامی حکومت کے معاملے میں خود مختار ہوں اور محض عمومی مرکزی اقتدار کے اعتبار سے متحد ہوں۔ اس کے برخلاف خلافت وحدت کا نظام ہوتا ہے، جہاں مثلاً مغرب میں مراکش اور مشرق میں خراسان کی وہی حیثیت ہوگی جو قاہرہ کے علاقے الفیوم کی ہے، خواہ قاہرہ خلافت کا دارالحکومت ہی ہو۔ نیز تمام علاقوں یا صوبوں کی مالیات اور اُن کا بجٹ یکساں بنیادوں پر ہوگا، جو تمام عوام کی بہبود اور مفاد کیلئے صرف کئے جانے کیلئے ہے خواہ یہ عوام کسی بھی صوبے یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ لہٰذا اگر کسی صوبے کی آمدنی اُس کی ضروریات سے دوگنی ہو تو بھی اُس پر جو خرچ کیا جائے گا وہ اُس صوبے کی ضروریات کے تناسب سے ہوگا نہ کہ اُس کی آمدنی کے لحاظ سے؛ اس کے برعکس اگر کسی صوبے کی آمدنی اُس کی ضروریات کے بقدر نہیں ہو تو اس بات کا لحاظ نہیں کیا جائے گا اور اُس صوبے پر ریاست کے عام بجٹ میں سے اُس کی ضروریات کے بقدر خرچ کیا جائے گا، خواہ اُس صوبے کی آمدنی اس کی ضروریات پوری کرنے کیلئے کافی ہو یا ناکافی۔

خلافت کوئی جمہوری نظام نہیں ہے، جمہوری نظام کا آغاز بادشاہت کے نظام کا ردِّ عمل تھا۔ بادشاہی نظام میں بادشاہ اپنے ملک اور عوام پر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق حکومت و تصرف کیا کرتا تھا، وہ اپنی مرضی سے قوانین وضع کرتا تھا۔ پھر جمہوری نظام آیا اور اقتدار و بالادستی عوام کو منتقل کر دی گئی اور اس نظام کو جمہوری نظام کہا گیا۔ اب عوام قوانین وضع کرنے لگے اور حلال و حرام طے کرنے لگے اور اعمال کو اچھا یا برا قرار دینے لگے۔ صدارتی طرزِ جمہوریت میں حکمرانی صدرِ جمہوریہ اور اُس کے وزراء کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جبکہ پارلیمانی جمہوریت میں حکمرانی وزارتی کابینہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ (وزراء کی مجلس کے بااقتدار ہونے کی مثال بادشاہت کے نظام میں بھی ملتی ہے جہاں بادشاہ حکومت کے اختیارات وزراء کی مجلس کو منتقل کر دیتا ہے اور وہ خود علامتی طور پر بادشاہ رہتا ہے اور براہِ راست حکمرانی نہیں کرتا)۔

رہی بات اسلام کی تو اس میں قانون سازی کا اختیار عوام کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، اور اُس کے سوا کسی اور کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ حلال اور حرام طے کرے۔ قانون سازی کا حق انسانوں کو دے دینا اسلام کی رُو سے جرمِ عظیم ہے۔ جب سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی: **﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ "انہوں نے اللہ سے ہٹ کر اپنے فقہا اور راہبوں کو اپنا ربّ بنالیا"** (التوبہ: 31) تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی کہ اُن کے علما اور راہب اُن کیلئے قانون وضع کرتے تھے اور حلال و حرام کا تعین کرتے تھے، اور لوگ اس معاملے میں اپنے علما اور راہبوں کی اطاعت کرتے تھے؛ اُن لوگوں کے اسی عمل کو رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنے علما اور راہبوں کو اپنا ربّ بنالینا قرار دیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی بجائے حلال و حرام کا خود تعین کرنا کتنا بڑا جرم اور گناہ ہے۔ ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے: **«أتيت النبي ﷺ وفي عنقي صليب من ذهب، فقال يا عدي اطرح عنك هذا الوثن. وسمعته يقرأ في سورة براءة ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ قال: أَمَا إنهم لم يكونوا إذا أحلوا لهم شيئاً استحلوه، وإذا حرّموا عليهم شيئاً حرَّموه» "میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی، اس بُت کو اُتار پھینکو؛ پھر میں نے سنا آپ ﷺ سورۂ توبہ کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: انہوں نے اللہ سے ہٹ کر اپنے علما اور راہبوں کو اپنا ربّ بنالیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: وہ لوگ اپنے راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، لیکن جب اُن کے راہب کوئی چیز اُن کیلئے حلال کر دیتے تو وہ اُس کو حلال سمجھتے اور جب وہ راہب کسی چیز کو حرام قرار دے دیتے تو وہ لوگ اُسے حرام مان لیتے تھے"۔**

اسی طرح اسلام کا نظامِ حکومت وزارتی کابینہ کی طرز کا نہیں ہوتا کہ جس میں وزراء کو خصوصی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور ہر وزارت کا خود مختار بجٹ ہوتا ہے کہ کسی کا بجٹ زیادہ ہے اور کسی کا کم اور پھر رقوم کو ایک مد سے دوسری مد میں منتقل کرنے کیلئے تاخیر طلب کارروائیاں کرنا پڑتی ہیں اور یوں عوامی بہبود کے کاموں میں رکاوٹ ہوتی ہے کیونکہ کسی ایک بہبودی کام کیلئے ایک سے زیادہ وزارتوں کی دخل اندازی ہوتی ہے، بجائے یہ کہ عوام کی بہبود کے کام

ایک ہی انتظامی ڈھانچے کے تحت جمع کر دیے جائیں۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ جمہوری نظام حکومت میں اقتدار مختلف وزارتوں میں تقسیم ہوتا ہے اور وزارتی کابینہ اجتماعی طور پر حکمران ہوتی ہے۔ جبکہ اسلامی نظام میں جمہوری طرز کی وزارتی کابینہ نہیں ہوتی کہ جو اجتماعی طور پر اقتدار کی حامل ہو۔ بلکہ امت خلیفہ کو اِس بات پر بیعت دیتی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ذریعے حکومت کرے اور پھر خلیفہ اپنے لئے معاونین (وزراء تفویض) مقرر کرتا ہے جو خلافت کی ذمہ داریاں نبھانے میں خلیفہ کی معاونت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ معاونین لغوی معنوں میں وزراء ہیں یعنی یہ اُن امور میں خلیفہ کی معاونت کرتے ہیں جو اُن کے سپرد کئے جائیں۔

اسلام کا نظامِ حکومت جمہوریت کے حقیقی معنوں میں جمہوری نظام نہیں ہوتا کیونکہ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کے پاس ہوتا ہے یعنی وہ حلال و حرام؛ اچھا اور برا طے کرنے میں احکام شریعت کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ ایسی پابندی آزادی کی راہ مسدود کرتی ہے۔ کفار اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جمہوریت کو اس کے حقیقی معانی کے ساتھ مسلمان قبول نہیں کریں گے، اسی لئے مغربی دنیا کے استعماری کفار اور اِس دور میں بالخصوص امریکہ جمہوریت کو مسلم ممالک میں دھوکے سے متعارف کراتے ہیں، پس وہ مسلمانوں کے جذبات کو متاثر کرنے کے لیے حکمران کے انتخاب کو نمایاں کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے سامنے جمہوریت کی جھوٹی تصویر کشی کی جائے کہ جمہوریت میں بنیادی امر یہ ہے کہ اس میں حکمران کو منتخب کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ مسلم ممالک میں ظلم و جبر کا دور دورہ ہے، زبانیں بزورِ طاقت بند کی جاتی ہیں اور آمرانہ حکومتیں مسلط ہیں؛ خواہ وہ بادشاہتیں ہوں یا جمہوریت کہلاتی ہوں، اس تمام تر کی وجہ سے کفار کیلئے یہ کہہ کر جمہوریت کو پیش کرنا آسان تھا کہ جمہوریت تو محض حکمران کو چُننے کا طریقہ ہے؛ اور انہوں نے جمہوریت کے بنیادی پہلو کو گول کر دیا کہ جمہوریت میں قانون وضع کرنا، حلال و حرام طے کرنا انسان کا حق ہے نہ کہ انسانوں کے رب کا۔ یہاں تک کہ بعض "اسلام پسندوں اور ان کے مشائخ" نے بھی اس فریب کو اچھی یا بری نیت سے قبول کر لیا ہے۔ جب آپ اُن سے جمہوریت کے بارے میں دریافت کریں تو وہ اس بناء پر اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ یہ تو حکمران کو منتخب کرنے کا طریقہ ہے، نیز جو لوگ اِس جمہوریت کو بدنیتی سے فروغ دے رہے ہیں

وہ اپنی لچھے دار باتوں میں جمہوریت کی اصلیت کو چھپا جاتے ہیں جس کا تعین خود اس نظام کے وضع کرنے والوں نے کیا ہے کہ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کے پاس ہوتا ہے اور وہ اکثریتِ رائے سے جو قانون چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ وہ جائز اور ناجائز کا تعین کر سکتے ہیں یا کسی عمل کے اچھے یا برا ہونے کو طے کر سکتے ہیں؛ نیز یہ کہ اس نظامِ جمہوریت میں فرد اپنے افعال و تصرفات میں "آزاد" ہے؛ وہ چاہے تو شراب پیئے، ٹھیک سمجھے تو زنا کرے، چاہے مرتد ہو جائے، مقدسات کی توہین کرے؛ جمہوریت و آزادی کے نام پر اُسے اِن سب کا اختیار ہے۔ یہی جمہوریت ہے اور یہی اس کے معانی، حقیقت اور اصلی چہرہ ہے۔ پھر ایک مسلمان جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو، کیسے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ جمہوریت جائز ہے یا جمہوریت اسلام سے ہے؟!

رہی بات حاکم کے امت کی جانب سے منتخب کئے جانے کی تو یہ معاملہ نصوص سے ثابت ہے۔ اسلام میں بالادستی یعنی Sovereignty شریعت کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی کے خلیفہ بننے کیلئے یہ بنیادی شرط ہے کہ اُسے لوگوں کی طرف سے بیعت دی جائے۔ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ اُس وقت سے عملاً رائج ہے جبکہ سارا عالم آمروں اور جابرانہ بادشاہتوں کے اندھیروں میں تھا۔ جس کسی نے بھی خلفائے راشدین کے انتخاب کے عمل کا بغور مطالعہ کیا ہو، وہ واضح طور پر دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح اہلِ حل و عقد اور مسلمانوں کے نمائندوں کی جانب سے ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی بیعت کو پورا کیا گیا تھا۔ عبدالرحمن بن عوفؓ، جنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ مسلمانوں کے نمائندوں (جو کہ مدینہ کے لوگ تھے) کی رائے معلوم کریں۔ وہ ہر ایک سے رائے لیتے تھے، ایک گھر سے دوسرے گھر چکر لگاتے تھے، عورتوں اور مردوں سے دریافت کرتے تھے کہ وہ لوگ امیدواروں میں سے کس کو خلافت کیلئے پسند کرتے ہیں، وہ اسی کام میں جتے رہے یہاں تک کہ اُنہیں لوگوں کی رائے معلوم ہو گئی اور پھر عثمانؓ کی بیعت ہوئی۔

مختصر یہ کہ جمہوریت کفر کا نظام ہے، اس لئے نہیں کہ جمہوریت میں حکمران کا انتخاب کیا جاتا ہے؛ یہ تو اصل موضوع ہی نہیں ہے؛ بلکہ اس لئے کہ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کا ہے نہ کہ عوام کے ربّ کا۔ اللہ سبحانہ

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ ﴾ "فیصلے کا اختیار تو بس اللہ ہی کا ہے" (الانعام: 57)۔ اسی طرح اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ "(اے محمد ﷺ) آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ آپ ﷺ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں، پھر جب آپ ﷺ فیصلہ کردیں تو یہ اپنے اندر کوئی گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں" (النساء: 65)۔ تشریع یا قانون سازی کے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہونے کے دلائل متعدد ہیں اور معروف ہیں۔

علاوہ ازیں جمہوریت ایسی شخصی آزادیوں کو پروان چڑھاتی ہے کہ مرد و عورت حرام و حلال کا لحاظ کئے بغیر جو جی چاہے کر سکتے ہیں؛ اسی طرح مذہبی آزادی کہ جس کے تحت کوئی اپنے مذہب سے پھر سکتا ہے اور بغیر کسی شرط کے اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے؛ پھر ملکیت کی آزادی جس کے ذریعے طاقت ور کثیر وسائل پر تسلط جما کر کمزور کا استحصال کرتا ہے اور نتیجتاً دولت مند کی دولت میں اور مفلس کی مفلسی میں اضافہ ہوتا ہے؛ نیز اظہارِ رائے کی آزادی، جو کہ حق بات کہنے کے لیے نہیں بلکہ یہ امت کے تقدسات کی توہین اور اہانت کے لیے ہے، حتیٰ کہ آزادی اظہار کے نام پر اسلام پر کیچڑ اچھالنے والوں کو نکتہ دان اور اعلیٰ و عمدہ رائے دان گردانا جاتا ہے اور انہیں انعاموں اور ایوارڈوں سے نوازا جاتا ہے۔

لہٰذا جیسا اوپر ذکر ہوا، اسلام کا نظامِ حکومت یعنی خلافت، نہ تو بادشاہت کا نظام ہے، نہ نوآبادیاتی شہنشاہیت کا، نہ یہ وفاقی ہے اور نہ ہی خلافت کوئی جمہوری نظام ہے۔

فہرست

اسلام کا بین الاقوامی سمندری قوانین کے متعلق نقطہ نظر

منیب الرحمٰن، پاکستان

جب خلاء سے ہماری دنیا کی کھینچی ہوئی تصویریں آتی ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ہماری دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ سمندر پر مشتمل ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری دنیا کو نیلی دنیا یعنی Blue planet کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ سمندر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جس کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمارے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک جب ہم پوری انسانی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اس سمندر سے ہم مچھلی کی صورت میں اپنا رزق حاصل کرتے ہیں، اور اس سمندر پر ہماری کشتیاں تیرتی پھرتی ہیں جو ہمارا سامانِ تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتی ہیں، ہوائی جہاز کے سفر عام ہونے سے پہلے تک اسی سمندر سے لوگ دور دراز کا سفر طے کرتے تھے، اور اسی سمندر پر بحری فوج تیار کر کے مزید علاقوں کو فتح کیا جاتا تھا۔ سائنس کی مدد سے ہمیں پتہ چلا کہ اس سمندر میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمارے لیے اور بھی کئی خزانے دفن کر رکھے ہیں جیسے پٹرولیم، گیس اور معدنی ذخائر وغیرہ۔ یقیناً سمندر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

﴿فَبِأَيِّ آلاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾

"تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے" (سورۃ الرحمٰن)

جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں پہلی بار شام کے والی امیر معاویہ کو بحری فوج تیار کرنے کا حکم ملا جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ کی جانب پہلا لشکر روانہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق اس پر چڑھائی کی، اسی طرح امیر معاویہ کے دور خلافت میں ہی بحری فوج کے

ذریعے بحیرہ روم میں قبرص کے جزائر فتح ہوئے، اسی طرح اندلس اور سسلی کی فتح بھی بحری فوج کے ذریعے ہوئی جبکہ سندھ کی فتح میں بحری فوج نے نقل وحمل کی مدد فراہم کی[1] ۔

بحری فوج کے ساتھ ساتھ مسلمان تاجروں نے بھی اسلامی دعوت کو پوری دنیا تک پھیلانے میں بحری راستوں کا بھرپور استعمال کیا۔ جنوبی ہند، سری لنکا، انڈونیشیا اور ملیشیاء کے جزائر اور چین کے جنوبی علاقوں تک اسلام کی دعوت ان مسلمان تاجروں کے بدولت ہی پہنچی۔

چونکہ اسلام میں نوآبادیات یعنی Colonization کا کوئی تصور موجود نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کی مقامی آبادی کے اسلام قبول کرنے کے بعد وہاں کی حکمرانی فطری طور پر ان ہی میں سے مقامی مسلمانوں کو منتقل ہوئی اور جو عرب تاجر وہاں آباد بھی ہوئے، وہ وہیں کے مقامی ماحول میں شریعت کے مطابق رچ بس بھی گئے اور کبھی مقامی لوگوں نے ان کو باہر کے لوگ یا استعمار کی طرح نہیں سمجھا کیونکہ اسلامی قانون تمام انسانوں پر یکساں لاگو ہوتا ہے اور لوگوں کے درمیان رنگ اور نسل کی بنیاد پر تفریق نہیں کرتا۔ یہ اس بات سے مختلف ہے کہ جب یورپی اقوام نے امریکہ، افریقہ اور ایشیاء سمیت دنیا کے کثیر حصے کو اپنی کالونیاں بنایا اور اپنے اور اپنی مفتوحہ اقوام کے لیے الگ الگ قوانین بنائے[2] ۔

بہر حال، خلفائے راشدین کے دور سے مسلمانوں نے اپنی بحری فوج کا آغاز کیا، جبکہ اموی خلافت نے روم کی بحری طاقت کو ختم کر کے مسلمانوں کو دنیا کی واحد بحری طاقت میں تبدیل کر دیا جن کی سمندروں پر حاکمیت بحیرہ روم، بحیرہ احمر، خلیج فارس اور بحیرہ عرب سے بحیرہ ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ عباسی خلافت میں بھی جوں کا توں جاری رہا یہاں تک عثمانی خلافت کا دور آگیا۔ مغرب یعنی یورپ کا مشرق یعنی ہندوستان اور چین سے تجارت کا سمندری راستہ مکمل طور پر مسلمانوں کے زیر نگین تھا، البتہ ایک زمینی راستہ موجود تھا جس کی بدولت یورپ مسلم علاقوں سے گزرے بغیر ہندوستان اور چین سے تجارت کر پاتے تھے اور وہ راستہ قسطنطنیہ سے گزر کر جاتا تھا۔ لیکن 1453 میں سلطان

محمد فاتح کی جانب سے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد یہ راستہ بھی یورپ کے لیے مفقود ہو گیا تھا، یعنی اب یورپ مشرقی اقوام سے تجارت کرنے کے لیے مکمل طور زمینی اور سمندری راستے سے مسلمانوں کے آگے بے بس اور لاچار تھے[3]۔

لیکن یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران اندلس میں مسلمان پستی کا شکار تھے اور 1492 میں جب اندلس میں مسلمانوں کی آخری اتھارٹی غرناطہ کا خاتمہ ہوا تو مسلمانوں کے علمی خزانے سے فیضیاب ہو کر یورپ کو دو بڑی طاقتور ریاستیں نصیب ہوئیں، ایک اسپین اور دوسری پرتگال۔ لیکن یہ ریاستیں بھی اتنی طاقتور نہیں تھی کہ کھلے سمندر میں عثمانی بحریہ کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے لیے تجاری راستیں کھول سکیں، اس لیے ان کی بھی کوششیں متبادل تجارتی راستوں کی تلاش میں تھیں کہ کسی طرح اسلامی علاقوں سے گزرے بغیر ہندوستان، چین اور مشرق بعید کی اقوام تک پہنچا جا سکے۔

کرسٹوفر کولمبس جو کہ ایک اطالوی نیویگیٹر (navigator) تھا، اس نے 1492 میں ایشیاء کی طرف جانے والے راستے کی تلاش میں اسپین کے بادشاہ کی طرف سے سپانسر کردہ مہم کی قیادت کی۔ تاہم وہ ہندوستان پہنچنے کی بجائے امریکہ پہنچ گیا۔ اس وقت تک امریکہ کو مسلمان جہاز ران اور چند دیگر اقوام دریافت کر چکے تھے اور وقتاً فوقتاً تجارت بھی کرتے رہتے تھے لیکن کبھی اسے اپنی کالونی نہیں بنایا تھا[4]۔

بہر حال کولمبس کے بعد دیگر بحری جہازوں نے بھی امریکہ کا سفر کیا جس کے نتیجے میں اسپین اور پھر یورپ کا امریکہ میں نوآبادیاتی نظام قائم ہوا۔ دوسری جانب پرتگال بھی متبادل راستے کی تلاش میں تھا اور ان کے نیویگیٹر واسکو ڈی گاما نے بھی ایک مسلمان نیویگیٹر "احمد ابن ماجد" کی مدد سے افریقہ کے انتہائی جنوب سے چکر کاٹ کر بحیرہ ہند سے ہوتے ہوئے ہندوستان تک کا متبادل راستہ معلوم کر لیا۔ واضح رہے کہ یہ راستہ بھی مسلمان جہاز رانوں کے استعمال میں پہلے سے تھا اور مغربی افریقی اقوام اسی بحری راستے سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتے تھے[5]۔ بہر حال واسکو ڈی

گاما کو اس راستے کے بارے میں معلوم ہونے کے نتیجے میں افریقہ کے ساحلی علاقوں میں پرتگال اور بعد میں آنے والے وقتوں میں یورپ کے افریقہ میں نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پڑی۔

چونکہ اس وقت اسپین اور پرتگال یورپ کی دو بڑی سمندری طاقتیں تھیں، اسی لیے نئے راستوں کی دریافت پر اسپین اور پرتگال کے بادشاہوں میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ نئے راستوں کی تجارت اور نوآبادیات کو کون کنٹرول کرے گا؟ پرتگال اس وقت اسپین کے مقابلے میں بڑی سمندری طاقت تھا۔ پرتگالی بادشاہ نے اپنے ہسپانوی ہم منصب کو ایک سخت خط بھیجا۔ ہسپانوی بادشاہ سمجھ گیا کہ اس کی ریاست کے پاس بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) میں اتنی بحری طاقت نہیں ہے کہ وہ پرتگالیوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اسپین نے سفارتی راستہ اختیار کیا۔ دونوں یورپی طاقتیں رومن کیتھولک عیسائی تھیں۔ اسپین نے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے پوپ الیگزینڈر ششم سے رابطہ کیا، ہسپانوی بادشاہ چرچ کے پسندیدہ تھے، کیونکہ وہ Reconquista کو پورا کرنے، اپنے مسلمان اور یہودی رعایا کی جبراً مذہب تبدیلی اور جلاوطنی کا حکم دینے کی وجہ سے عیسائی دنیا کے آنکھ کے تارے تھے۔ پوپ الیگزینڈر ششم نے انہیں "کیتھولک" کا خطاب بھی دیا تھا۔

4 مئی 1493 کو پوپ الیگزینڈر ششم نے مغرب کا سب سے آزمودہ ترین فارمولہ یعنی "حل وسط" (compromise) پر عمل کرتے ہوئے بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) کے تقریباً درمیان میں ایک لکیر کھینچی اور فرمان جاری کیا کہ اس لائن کے مغرب میں تمام زمینیں اسپین کی ہیں اور لائن کے مشرق کی تمام زمینیں پرتگال کی، یعنی اس نے غیر یورپی دنیا کو تقسیم کیا اور اسپین اور پرتگال کے درمیان کسی کیک کی طرح بانٹ دیا۔ لیکن پرتگال اس حد بندی سے خوش نہیں تھا، پرتگالی بادشاہ نے اسپین کے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کے ساتھ براہِ راست مذاکرات کا آغاز کیا۔ وہ لائن کو مغرب کی طرف مزید بڑھانا چاہتا تھا تاکہ وہ زیادہ حصہ پر قبضہ جما سکے۔

معاہدہ ٹورڈسلاس Tordesillas:

نتیجاً جون 1494 میں، ہسپانوی قصبے (Tordesillas) کے نام پر ایک معاہدے پر دستخط کیے گئے جس میں یہ طے کیا گیا کہ شمالی اور جنوبی لکیر کو برقرار رکھا جائے گا جو پوپ الیگزینڈر ششم نے کھینچی تھی لیکن اسے مزید مغرب کی طرف 920 میل (1480 کلو میٹر) بڑھا دیا گیا۔ اس طرح تمام افریقہ اور ایشیاء پرتگال کے پاس آیا اور شمالی اور جنوبی امریکہ اسپین کے پاس۔

اسی کے ساتھ ویٹیکن پوپ نے اسپین اور پرتگال دونوں پر زور دیا کہ وہ اپنی کالونیوں میں مقامی لوگوں کو عیسائی بنائیں۔ پوپ کے ان فرمانوں کو اسپین اور پرتگال دونوں نے اپنی نوآبادی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے استعمال کیا یہاں تک کہ اسپین نے براعظم امریکہ پر اور پرتگال نے افریقہ اور ایشیاء پر اپنی نوآبادی کو اپنا "الہامی حق" قرار دیا۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس زمانے کے یورپ کا عالمی قانون تھا، جس کا اسپین اور پرتگال دونوں پرچار کرتے تھے اور دفاع کرتے تھے کہ کوئی اس "قانون" کی خلاف ورزی نہ کرے اور امریکہ، افریقہ اور ایشیاء پر ان دو ملکوں کے علاوہ کسی کو کالونیاں بنانے کی اجازت نہیں اور ان سمندروں پر ان کی اجارہ داری کو قبول کیا جائے[6]۔

خلافت عثمانیہ جس کے لیے ظاہر سی بات ہے ان باتوں کی حیثیت نہیں تھی کیونکہ مسلمانوں کے لیے شارع صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سمندروں کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے، اسی لیے ہم اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر سمندروں پر اپنی حاکمیت کو برقرار رکھتے ہیں اور اس کو دوام بخشتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے مسلمان کئی صدیوں سے کرتے چلے آرہے تھے۔

نتیجاً افریقہ اور ہندوستان کے ساحلوں اور سمندروں پر عثمانی بحریہ اور پرتگال کے درمیان شدید بحری جنگوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اسپین کا محور امریکہ تھا جس میں خلافت عثمانیہ کی کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے اسپین سے مڈبھیڑ کے امکانات کم رہے سوائے اس کے کہ بحیرہ روم میں عثمانی بحریہ اور اسپین کا آمنا سامنا وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ لیکن

چونکہ پرتگال کا محور افریقہ اور ایشیاء تھا جس کے سمندروں پر خلافت عثمانیہ کی حاکمیت تھی، اس لیے پرتگال کے ساتھ معاملہ شدید تر رہا[7] ۔

جب سترہویں صدی عیسوی میں نئی یورپی سمندری طاقتیں ابھریں جیسا کہ انگلینڈ، ہالینڈ اور فرانس، تو یہ پروٹسٹنٹ تھیں نہ کہ کیتھولک۔ اسی لیے پوپ والے معاہدے کو انہوں نے بھی مسترد کر دیا۔ جبکہ اس دوران اسپین اور پرتگال کی طاقت بھی زوال کا شکار ہونے لگیں، نتیجتاً کسی بھی یورپی ملک کے لیے اسپین اور پرتگال کے زیر کنٹرول علاقوں کو اپنی نوآبادیات بنانا ممکن ہو گیا۔ اسی کے ساتھ جب یورپ میں طاقت کا توازن بگڑا تو سمندروں کے متعلق بھی نئے قوانین مرتب پانے لگے۔ یعنی پرانی طاقتور ریاستوں نے پوپ کے فرمان جس کو وہ اپنے لیے عالمی قانون سمجھتے تھے، نئی طاقتور ریاستوں نے ان کو ختم کر کے اپنے حساب سے نئے عالمی قوانین مرتب کرنے شروع کر دیے[6] ۔

اور اس میں سب سے زیادہ پیش پیش ہالینڈ تھا۔ ہالینڈ کے قانون دان Hugo Grotius جن کو جدید عالمی قانون کا بانی بھی تصور کیا جاتا ہے، اس نے سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ ساحلی ریاستوں کا ملحقہ پانیوں پر حق ہے، جس کی چوڑائی کا تعلق اس پر مؤثر کنٹرول کرنے کی صلاحیت سے ہے۔ اس کی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ہالینڈ کے ایک اور قانون دان Cornelius van Bynkershoek نے Grotius کے خیال کو عملی طور پر یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس طرح کے مؤثر کنٹرول کو ساحلی ریاست کے ہتھیاروں کی حد کے مطابق ہونا چاہئے۔ اطالوی وکیل Ferdinand Galiami اس وقت کی سب سے جدید توپ کی رینج تین سمندری میل تک طے کرتے تھے۔ پس یہ تصور عالمی قانون بن گیا اور اسے ''Canon shot rule' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 17 ویں صدی کے آس پاس اسے علاقائی سمندر کی چوڑائی کا بین الاقوامی طور پر قبول شدہ پیمانہ تصور کیا جاتا تھا۔ لہذا "سمندروں کی آزادی" کا تصور وسیع طور پر یہ تھا کہ قومی اور ریاستی حقوق پانی کی ایک مخصوص پٹی تک محدود ہے جو کسی ملک کے ساحلی پٹی سے عام طور پر تین سمندری میل (3 میل کی حد) تک پھیلے ہوئے تھے۔ قومی حدود سے باہر کے تمام پانیوں کو

بین الاقوامی پانی (International water) سمجھا جائے گا، جو تمام اقوام کے لیے قابل رسائی ہوگا، اور اس پر کسی کا بھی حق یا دعویٰ نہیں ہوگا[6]۔

20 ویں صدی کی شروعات میں کچھ ممالک نے مچھلی کے ذخیرے کی حفاظت کے لیے اور معدنی وسائل کو شامل کرنے اور آلودگی پر قابو پانے کے ذرائع فراہم کرنے کے لیے قومی سمندری حدود کو وسیع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیگ آف نیشنز نے 1930 میں The Hague میں ایک کانفرنس بلائی لیکن کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ سب سے بڑی سمندری طاقت بن کر ابھرا، اور جیسا کہ تاریخ انسانی کا اصول رہا ہے کہ ہمیشہ طاقتور ہی اصول اور قوانین بناتے ہیں جس کو وہ عالمی قانون کا نام دیتے ہیں۔ 1945 میں، امریکی صدر Harry S. Truman نے اپنے قدرتی وسائل کے تحفظ کے لیے کسی قوم کے حق کے روایتی بین الاقوامی اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے، اس کے براعظمی جغرافیہ کے تمام قدرتی وسائل تک امریکی کنٹرول کو بڑھا دیا۔

دوسرے ممالک نے بھی اس حکمت عملی کو اپنانے میں جلدی کی، کچھ ممالک اپنے ماہی گیری پانیوں کو 200 سمندری میل تک لے جاتے ہیں۔ جبکہ کچھ ممالک نے اپنے قومی سمندروں کو 12 ناٹیکل میل تک پھیلا دیا۔

اس کے بعد ان تصورات کو تین قراردادوں، 1958 کی اونچے سمندروں کی جنیوا کنونشن، 1960 کی سمندروں کے قانون کی دوسری کانفرنس اور 1982 کی سمندروں کے قانون کی اقوامِ متحدہ کی کنونشن کے ذریعے قانونی حیثیت دی گئی[6]۔

اب اگر ہم پاکستان کی طرف آئیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کی سمندری حدود بھی 200 ناٹیکل میل پر مشتمل ہے یعنی اس کے بعد بین الاقوامی سمندر شروع ہو جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس بین الاقوامی سمندر میں جو بھی نقل و حمل ہوگی اس سے پاکستان کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ سالوں میں دو مرتبہ بھارتی

آبدوز بین الاقوامی سمندر سے پاکستانی سمندری حدود میں داخل ہوگئی لیکن ہماری طاقتور بحریہ نے صرف انتباہ دینے پر اکتفاء کیا اور ان کو بحفاظت بین الاقوامی سمندر میں واپس بھیج دیا۔ اسی طرح ہم آئے دن خبروں میں سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں کہ پاکستانی اور بھارتی ماہی گیر ایک دوسرے کی سمندری حدود میں داخل ہوگئے جن کو پاکستانی اور بھارتی بحریہ گرفتار کرلیتی ہے اور دونوں طرف کے غریب ماہی گیر ان نام نہاد عالمی سمندری قوانین کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور کئی کئی سال تک جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں[8] [9]۔

اسی طرح 1999 میں بحرِ اوقیانوس کا واقعہ پیش آیا کہ جب پاکستانی بحریہ کے مسافر بردار طیارے کو بھارتی فضائیہ نے نشانہ بنایا اور ہمارے 16 سپاہی شہید ہوگئے، چونکہ طیارے کے ملبے کے ٹکڑے پاکستانی اور بھارتی سمندری حدود کے دونوں طرف پائے گئے تھے اس لیے دنیا نے بھارت کو مورد الزام ٹھہرانے سے گریز کیا جبکہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی روایتی بزدلی دکھاتے ہوئے زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہیں کیا[10] ۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ اور مغربی استعماری ممالک کی بحری افواج انہی نام نہاد بین الاقوامی سمندر روں میں کھڑی ہو کر اپنے طیارہ بردار بحری جہازوں (Aircraft carrier) سے مسلمان ممالک پر بمباری کرتی ہیں اور ہمیں لہولہان کرتی ہیں، یہاں تک کہ ان کی بحری افواج مسلمان ممالک کی سمندری حدود سے بھی ہو کر گذرتی ہیں جیسا کہ سوئز کینال اور آبنائے ہرمز یا Malacca strait ۔اور یہ سب کچھ ہمارے اوپر مسلط ان "روبیضہ" حکمرانوں کی وجہ سے ہے[11] ۔

اسی طرح اگر عالمی سطح پر دیکھیں تو چین اپنے شمالی سمندر میں اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے مصنوعی جزیرے بنارہا ہے تاکہ ان کو جواز بنا کر وہ اپنی سمندری حدود کو وسعت دے سکے۔ جبکہ امریکہ اور مغرب اس کو بین الاقوامی سمندر کی خلاف ورزی قرار دے رہے ہیں۔ اسی طرح آرکٹک سمندر میں امریکہ، کینیڈا، شمالی یورپی ممالک اور روس کے درمیان سمندری حدود کی بنیاد پر تنازعہ چلتا رہتا ہے کیونکہ وہ علاقہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ غرض یہ کہ

200 ناٹیکل میل کا سمندری حدود والا معاملہ اُن ممالک کے درمیان شدید پیچیدگی اور تنازعہ کا باعث بنتا ہے جو آپس میں انتہائی قریب قریب ہوں یا جن کے درمیان سمندری فاصلہ 400 میل سے کم ہو کیونکہ ایسی صورت میں دونوں ممالک اپنے 200 ناٹیکل میل سمندری حدود والے بین الاقوامی قوانین کی بنیاد پر ایک دوسرے کے سمندروں پر اپنا دعویٰ اور حق گردانتے ہیں[12] [13]۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عالمی قانون یا بین الاقوامی سمندر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی اصول چلتا رہا ہے جس کو "جس کی لاٹھی، اس کی بھینس" کہا جاتا ہے یعنی جو طاقتور ہوتا ہے وہ ہی اصول اور قوانین بناتا ہے۔ موجودہ دور کے تمام اصول اور قوانین امریکہ اور مغرب نے اپنی استعماری فائدوں کو مد نظر رکھ کر بنائے ہیں جن کو وہ باقی دنیا کو عالمی قانون یعنی بین الاقوامی قوانین بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ ان کے مفاد میں بھی ہے تاکہ وہ بھی ان قوانین کو اس طرح اختیار کریں جیسے یہ ان کے قوانین ہوں، اس کی پاسداری کریں، پرچار کریں اور اس کا دفاع کریں، جیسے انہی میں ان کی بقا ہو۔ نتیجاً امریکہ اور مغرب نے اپنے بنائے ہوئے استعماری قوانین کو دنیا پر صرف مسلط نہیں کیا ہے بلکہ اس کو قبولیت دلوائی ہے اور باقی دنیا کو اس کی اپنائیت دلوائی ہے، جس کی وجہ سے پوری دنیا امریکہ اور مغرب کے استعمار کو بین الاقوامی قوانین کے نام پر دوام بخش رہی ہے، یعنی اپنے ہاتھوں اپنی ہی پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اپنے آپ کو غلام بنا رہے ہیں اور اپنی غلامی کی قانونی حیثیت کی توثیق بھی کر رہے ہیں۔

جس طرح زمین پر استعمار کی کھینچی ہوئی لکیریں باطل ہیں، اسی طرح استعمار کی بنائی ہوئی یہ سمندری حدود بھی باطل ہیں۔ جس طرح ویسٹ فیلیا کے تصور پر مبنی ان زمینی سرحدوں کو مقدس سمجھنا حرام ہے ویسے ہی معاہدہ ٹورڈسلاس پر مبنی ان سمندری حدود کو مقدس سمجھنا بھی حرام ہے۔ جس طرح قومی ریاستوں کے تصور کا مقصد خلافت عثمانیہ کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنا تھا، ویسے ہی سمندری حدود کے تعین کے تصور کے پیچھے بھی سمندروں سے عثمانی بحریہ کی حاکمیت کا خاتمہ مقصود تھا۔

پس مسلمانوں کے لیے یہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں کہ وہ طاغوت کے بنائے ہوئے ان قوانین کو قبول کریں اور ان پر یقین رکھیں اور اپنے مسائل کے تصفیے کے لیے ان کی طرف رجوع کریں، جیسا کہ اللہ سبحان و تعالیٰ کا ارشاد ہے،

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴾

"کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس چیز پر ایمان لانے کا دعوٰی کرتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اسے نہ مانیں، اور شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور جا ڈالے" (سورۃ النساء: 60)

جہاں تک آنے والی ریاستِ خلافت کا تعلق ہے جس کا قیام اللہ کے اذن سے بہت قریب ہے، اس کا طرزِ عمل اور پالیسی وہی ہو گی جو کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تھی، جس کی بنیاد اللہ سبحان و تعالیٰ کے اس ارشاد پر مبنی ہے،

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾

"اور ان سے لڑنے کے لیے جو کچھ قوت سے اور صحت مند گھوڑوں سے جمع کر سکو سو تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسروں پر رعب پڑے، جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے" (سورۃ الانفال: 60)

پس اسلامی ریاستِ خلافت کی بحری پالیسی اسی آیت پر مبنی ہے، جس میں مسلمانوں کو عام حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ ان کافروں کے مقابلے بھرپور قوت حاصل کریں۔ اس کے لیے جدید جنگی بحری جہاز، آبدوزیں، طیارہ بردار جہاز تیار

کیے جائیں تاکہ جس طرح اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کو قائم کیا جائے، ویسے ہی اللہ کے سمندروں پر اللہ کے نظام کی حاکمیت قائم کی جائے۔ اسی طرح جیسے زمین پر جہاد و قتال کے ذریعے کفر کی اتھارٹی کو ملیامیٹ کیا جائے ویسے ہی سمندروں کو حربی کفار کو منہ توڑ جواب دیا جائے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم ہے،

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور اللہ کا دین قائم ہو جائے (سورۃ البقرۃ: 193)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاستِ خلافت اس بات کو بھی ممکن بنائے گی کہ کسی کا استحصال نہ ہو، کیونکہ ریاستِ خلافت کوئی استعماری اور نو آبادیاتی ریاست نہیں ہے۔ اسی طرح ریاستِ خلافت عالمی رواج کا بھی اس حد تک احترام کرے گی جہاں تک شریعت نے ہمیں اجازت دی ہے۔ پس چونکہ سمندر کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے عوامی ملکیت قرار دیا ہے، اس لیے ریاستِ خلافت کسی کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے سے نہیں روکے گی۔ پس وہ غریب ماہی گیر جن کا تعلق حربی کفار ممالک سے بھی ہو ان کو سمندر سے رزق حاصل کرنے سے نہیں روکا جائے گا[14]۔ البتہ وہ معدنی ذخائر جیسا کہ تیل اور گیس وغیرہ جس سے وہ حربی ممالک طاقت حاصل کر سکیں، اس کو حاصل کرنے سے ان کو ممکنہ حد تک روکا جائے گا۔ اسی طرح ریاستِ خلافت خود بھی سمندر میں سائنسی تحقیق کو فروغ دے گی اور باقی اقوام کو بھی اس سلسلے میں نہیں روکے گی۔ جہاں تک تجارتی بحری جہازوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ریاستِ خلافت چار طرح کا معاملہ کرے گی،

1) وہ تجارتی بحری جہاز جو ریاستِ خلافت کے اپنے شہریوں کے ہیں، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ان کے لیے سہولیات اور آسانی فراہم کرے گی اور ان سے کسی بھی قسم کا ٹیکس لینا حرام ہے۔

2) وہ تجارتی بحری جہاز جن کا تعلق ان ممالک سے ہو جن کے ساتھ ہمارے اقتصادی، تجارتی معاہدات ہیں، یعنی اہلِ معاہد، ان کے ساتھ ان کے معاہدات کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

3) وہ تجارتی جہاز جن کا تعلق استعماری ممالک سے ہو، لیکن فی الحال حالتِ جنگ میں نہ ہو، ان کے متعلق ہر طرح کی احتیاط برتی جائے گی، ان کے تجارتی جہازوں کی تلاشی لی جائے گی کہ کہیں کوئی ایسا سامان تو نہیں جارہا جس سے ان کو عسکری تقویت حاصل ہورہی ہے، اور ان کے تجارتی جہازوں سے اتنا ہی ٹیکس لیا جائے گا جتنا وہ ہمارے جہازوں سے لیتے ہیں۔

4) وہ تجارتی بحری جہاز جن کا تعلق ان ممالک سے ہو جن کے ساتھ مسلمان عملاً حالتِ جنگ میں ہوں، ایسے تجارتی جہازوں کو ان کے تجارتی سامان سمیت ضبط کر لیا جائے گا اور ان کے تجارتی جہاز کے عملے کو قیدی بنا لیا جائے گا[15] ۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تمام انسانوں کے لیے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا ہے اور شریعت محمدی تمام انسانوں کے لیے قانون ہے، جس کی اتباع ہی میں ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔ پس جس طرح ہمارے پیارے نبی ﷺ نے اللہ کے پیغام کو ہم تک پہنچایا، اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے تمام انسانوں تک پہنچائیں اور ان کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر اسلام کی روشنی سے منور کریں۔ اور اس کے لیے اسلام نے ہمیں جو طریقہ کار دیا ہے وہ دعوت و جہاد ہے۔ پس جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمان تاجروں نے بحری راستوں کے ذریعے اسلامی دعوت کو مشرقِ بعید کے جزیروں تک پہنچایا، اور جہاد کے ذریعے مغرب میں اندلس کو فتح کیا، ویسے ہی آج ہمارے لیے یہ مثالیں مشعلِ راہ ہیں کہ ہم بھی ہر ممکن ذریعے سے دینِ اسلام کو پوری دنیا تک دعوت و جہاد کے ذریعے پھیلائیں۔ اور ایسا صرف اس وقت ہی ہوگا جب اللہ کے نظام کو قائم کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کو دنیا تک پھیلانے والی ریاست موجود ہوگی کیونکہ خلیفہ کو امت اسی بنیاد پر بیعت دیتی ہے کہ وہ اسلام کو اندرونی طور پر نافذ کرے گا اور بیرونی طور پر پوری دنیا تک پھیلانے کے لیے دعوت و جہاد کے طریقہ پر ہر ممکن ذرائع کو استعمال کرے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں موجودہ عالمی آرڈر کی حقیقت، اس کی تاریخ اور پس منظر، اور اس کے فریب کو سمجھنا بھی ضروری ہے تاکہ ہم وہ فکری اور سیاسی بصیرت حاصل کر سکیں جس کے ذریعے ہم آنے والی ریاستِ خلافت کو فکری اور سیاسی طور مضبوط کر سکیں، خلیفہ کو وزنی فکری اور سیاسی دلائل کی بنیاد پر مشورہ دے سکیں اور اس پر امت کو قائل کر سکیں۔ خلیفہ کی ممکنہ فکری اور سیاسی غلطیوں کی نشاندہی کر سکیں تاکہ اس کی اصلاح ممکن ہو اور اس کا احتساب کر سکیں۔ کیونکہ یہی وہ عوامل تھے جن کی خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں بتدریج پستی اور عدم موجودگی اس کے زوال کا سبب بنیں اور یہی وہ عوامل ہوں گے جن کی موجودگی امت کے دوبارہ احیاء کا سبب بنے گی۔

حوالہ جات:

1. سیرۃ الصحابہ خلفائے راشدین (شیخ شاہ معین الدین احمد ندوی)
2. اسلامی ریاست (شیخ تقی الدین نبہانی)
3. سلطنتِ عثمانیہ (ڈاکٹر علی محمد الصلابی)
4. The African, and Muslim, Discovery of America – Before Columbus, Book by Dr. Abdullah Hakim Quick
5. مسلمان جہازران (تابش صدیقی)
6. Elements of Blue Economy by Vice Admiral Retd Iftikhar Ahmed Rao
7. https://historyofislam.com/contents/onset-of-the-colonial-age/the-portuguese-devastations-in-the-indian-ocean
8. https://www.dawn.com/news/1678075
9. https://www.dawn.com/news/1698694

.10
https://en.wikipedia.org/wiki/1999_Pakistan_Breguet_1150_Atlantic_shotdown
.11 https://maritime-executive.com/editorials/beyond-the-gulf-broadening-u-s-maritime-security-ops-in-the-mideast
.12 https://www.aljazeera.com/news/2021/11/19/china-supports-maritime-militia-to-assert-south-china-sea-claim
.13 https://en.wikipedia.org/wiki/Territorial_claims_in_the_Arctic#:~:text=The%20status%20of%20certain%20portions,km))%20or%20internal%20waters.
14. سوال وجواب: دریاؤں سے متعلق شرعی قواعد (شیخ عطاء بن خلیل ابو رشتہ)
15. مقدمہ دستور، دفعہ نمبر: 189 (شیخ تقی الدین نبھانی)

فہرست

قطر اور مغرب کی اصلیت کو آشکار کرتا ہوا 2022 کا فیفا ورلڈ کپ

ڈاکٹر عبدالبصیر، پاکستان

کھیلوں کی کمرشلائزیشن

کھیل، ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ ٹیموں کی صورت میں کھیلے جانے والے کھیل اس لحاظ سے اور بھی بہتر ہوتے ہیں کیونکہ ان سے ٹیم ورک بھی سیکھنے کو ملتا ہے۔ فٹ بال کا کھیل، جسے ساکر soccer بھی کہا جاتا ہے، ٹیم کی صورت میں کھیلے جانے والے اُن چند کھیلوں میں شمار ہوتا ہے جہاں پورے کھیل کے دورانیہ میں تقریباً ہر کھلاڑی کو اپنی بھرپُور صلاحیتیں اور جوہر دکھانے اور کھیل میں اپنا کردار ادا کرنے کا مساوی موقع ملتا ہے۔ لیکن بہر حال کھیل اور ان کی بطورِ تجارت کمرشلائزیشن دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ کھیل ایک صحت مندانہ سرگرمی ہوتی ہے جس کا معاشرے کی تعمیر میں ایک مثبت کردار ہوتا ہے جبکہ کھیلوں کی کمرشلائزیشن یا نمائش، کسی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری سے مماثلت رکھتی ہے جہاں کھلاڑی، بطورِ ماڈل یا اداکار پیش کیے جاتے ہیں اور ان کھیلوں کی کمرشلائزیشن میں عوام کا کردار فقط اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ بس سٹیڈیم کی سیٹوں یا اپنے ڈرائنگ روم کے صوفوں پر ہی براجمان بیٹھے رہیں۔ کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ ان کے کھیلوں کے کلب بھی خرید لیے جاتے ہیں، کھیلوں کے نشریاتی حقوق کو بھی فروخت کے لیے پیش کیا جاتا ہے اور ان کی نیلامی ہوتی ہے، ٹکٹوں کے ساتھ ساتھ سپانسرز بھی فروخت کیے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس حد تک ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر عالمی سطح کے تماشائیوں کے بڑے ہجوم کی وجہ سے، زیادہ تر ایسے تمام

کھیلوں کو تماش بینوں کا کھیل[1] کہا جاتا ہے کیونکہ ایسے کھیل عالمی سطح پر تماشائیوں کے ایک بڑے حجم کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں جس کے نتیجے میں کثیر آمدنی ہوتی ہے جو کہ اربوں ڈالر[2] تک چلتی ہے۔

فُٹ بال کی کمرشلائزیشن

کھیلوں کی دنیا میں مارکیٹ شیئر اور آمدنی کے لحاظ سے فٹبال کا کھیل سب سے آگے ہے اور دنیا کی تقریباً نصف آبادی (3.5 ارب سے زائد) کے شائقین[3] کے ساتھ اس کھیل کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ حالانکہ قطر، فٹبال کھیلنے والے مشہور ممالک کی فہرست میں شامل نہیں ہے لیکن پھر بھی قطر نے بڑی اُمیدوں اور خطیر سرمایہ کے ساتھ 2022 میں منعقد ہونے والے ورلڈ کپ کی بولی میں حصہ لیا، جبکہ وہ یہ بولی پہلے ہی 2010 میں جیت چکا تھا جب قطر کو کچھ مخفی و پوشیدہ انداز میں ایک ساتھ دو اکٹھے ورلڈ کپ[4] اپنے ملک میں منعقد کرانے کا موقع نوازا گیا۔ اس چھوٹی سی قوم نے بغیر کسی تنازعہ کے یہ بولی جیت کر پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ فیفا حکام کو بھاری رشوتیں دینے کی باتیں زبان زدِ عام[5] تھیں جس کی بنیادی وجہ، اس طرح کے بڑے پروگرام کی میزبانی کے لیے قطر جیسے ملک کا انتہائی غیر موزوں ہونا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کی دیگر اقوام کے برعکس، فٹبال نہ تو قطر کا ثقافتی کھیل ہے اور نہ ہی ان کی روایت میں شامل ہے، جبکہ فیفا کے سابق صدر سیپ بلاٹر Sepp Blatter، جو کہ اُس وقت فیفا کے انچارج تھے جب قطر کو ورلڈ کپ کے انعقاد کے لیے نوازا گیا، ان کے مطابق مصر، الجزائر اور تیونس فیفا ورلڈ کپ کی میزبانی کے لیے زیادہ مستحق

[1] https://www.thebusinessresearchcompany.com/report/spectator-sports-global-market-report

[2] https://www.statista.com/topics/1595/soccer/#dossierKeyfigures

[3] https://www.worldatlas.com/articles/what-are-the-most-popular-sports-in-the-world.html

[4] https://www.pbs.org/newshour/world/the-world-cup-is-officially-underway-in-qatar-heres-why-its-so-controversial

[5] https://www.nytimes.com/2020/04/06/sports/soccer/qatar-and-russia-bribery-world-cup-fifa.html

تھے؛ یاد رہے کہ فیفا کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے تمام عرصہ کے دوران سیپ بلاٹر پر کرپشن کے الزامات تھے۔ اگرچہ قطر نے ان تمام الزامات کی تردید کی ہے لیکن فیفا کی ایگزیکٹو کمیٹی کے 22 میں سے 11 ارکان کو یا تو معطل کر کے ان پر جُرمانہ عائد کیا جا چُکا ہے یا ان پر تاحیات پابندی یا کرپشن کے الزامات میں مقدمات ہو چکے ہیں۔ قطر نے ورلڈ کپ کے انتظامات اور انفراسٹرکچر پر 229 ارب امریکی ڈالر[6] کا کثیر سرمایہ خرچ کر کے دنیا کو ایک بار پھر حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ کسی بھی ملک کی جانب سے ورلڈ کپ پر خرچ کی جانے والی، یہ اب تک کی سب سے خطیر رقم تھی اور اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس سے قبل ہونے والے مہنگے ترین ورلڈ کپ میلوں میں 2014 کا برازیل اور 2018 کا روس کا ٹورنامنٹ تھا، اور ان دونوں ٹورنامنٹ پر ہونے والے خرچہ کی لاگت کا تخمینہ 15 بلین ڈالر[7] سے بھی کم تھا۔

کھیلوں کے انعقاد سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بہتر کرنے کی کوشش

ورلڈ کپ کے انفراسٹرکچر اور سٹیڈیم کی تعمیر پر بے تحاشا خرچ نے ورلڈ کپ کے سابقہ چند میزبان ممالک کو بھاری قرض تلے دبا دیا تھا اور ان اخراجات کے نتیجے میں ایسی تعمیرات باقی بچی تھیں جن کا فیفا ورلڈ کپ کے اختتام کے بعد کچھ استعمال نہ رہا تھا[8]۔ یہ قطر کی جانب سے کی جانے والی sportswashing[9] کی ایک کھلی اور واضح کوشش تھی، Sportwashing ایک ایسی اصطلاح ہے، جو کسی افراد، اداروں یا حکومتوں کو اپنی وہ ساکھ بہتر بنانے کی

[6] https://www.sportingnews.com/in/football/news/cost-world-cup-qatar-how-much-paid-fifa-most-expensive-2022/i69pi7uree5ctahcjyuzd9fn

[7] https://www.dw.com/en/qatar-world-cup-will-be-the-most-expensive-of-all-time/a-63681083

[8] https://www.cnbc.com/2022/11/10/why-hosting-the-world-cup-can-be-a-bad-idea-for-some-countries.html

[9] https://en.wikipedia.org/wiki/Sportswashing

کوشش کے لیے استعمال ہوتی ہے، جو ساکھ ان کی اپنی حرکتوں کی وجہ سے داغدار ہو چکی ہو۔ سعودی ولی عہد، محمد بن سلمان Sportwashing کی ایسی حرکتوں کا چیمپئن مانا جاتا ہے اور وہ اس کو نئی انتہا تک لے کر جا چکا ہے[10]۔

عالمی سطح پر اپنی ساکھ کو بہتر بنانے کی بھونڈی کوشش کے علاوہ، ایسی حرکتیں علاقائی سطح پر بھی قومیت کا تڑکا لگاتے ہوئے ان حکومتوں کے کام آتی ہیں جو اسلام کو اپنی پہچان کا بنیادی عنصر بنانے کی بجائے کھیلوں کو فروغ دیتی ہیں۔ مزید برآں، ایسے بڑے پروگرام، بڑے پیمانے پر عوام کی توجہ منتشر کرنے کے ہتھیار[11] کے طور پر کام کرتے ہیں جیسا کہ کچھ مؤرخین اور فلسفیوں کے مطابق زمانۂ قدیم میں بھی اولمپک کھیل منعقد کرانے کا اصل مقصد یہی ہوتا تھا[12]۔ سب حکمران، بلکہ خصوصاً ظالم و جابر حکمران، آمر اور بادشاہ یہی چاہتے ہیں کہ ان کے عوام اپنے حکمران کی قانونی حیثیت اور کرپشن پر سوال اُٹھانے کی بجائے، بس گول گننے میں لگے رہیں۔ اس کے علاوہ ورلڈ کپ کی میزبانی کرنا، میزبان ملک کے لیے کوئی نفع بخش کاروبار نہیں ہے، جیسا کہ مطالعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اتنی بھاری سرمایہ کاری کے باوجود بھی میزبان ملک کو کوئی خاطر خواہ مالی آمدن حاصل نہیں ہوتی[13]۔ البتہ میزبان کے برعکس، ورلڈ کپ اپنے انتظامی ادارے یعنی فیفا کے لیے ہمیشہ منافع بخش ہوتا ہے جس کی آمدن 7.5 ارب ڈالر تک جا پہنچی ہے جو کہ پچھلے منعقد ہونے والے ورلڈ کپ سے بھی 1 ارب ڈالر زائد ہے[14]۔

[10] https://www.theglobalist.com/uk-premier-league-soccer-sport-newcastle-united-saudi-arabia-mohammed-bin-salman-soft-power/

[11] https://www.cambridge.org/core/journals/china-quarterly/article/abs/beijing-olympics-as-a-campaign-of-mass-distraction/F6C9F285432857EC4B1B5A18503D4BF0

[12] http://www.idcommunism.com/2016/08/olympic-games-and-fascism-olympic.html

[13] https://www.aljazeera.com/sports/2022/11/17/do-host-countries-make-money-from-the-world-cup

[14] https://www.bloomberg.com/news/articles/2022-11-20/fifa-revenue-hits-7-5bn-for-qatar-world-cup-period

تصویر کا دوسرا رُخ

اب جبکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ کن حالات میں قطر ورلڈ کپ کا انعقاد ہو رہا ہے تو آئیں تصویر کے دونوں رُخ دیکھتے ہیں۔ جس میں ایک طرف تو وہ مغربی عوام و ممالک ہیں جو قطر کو ورلڈ کپ کی میزبانی دینے پر قطر اور فیفا کو شرمندہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف ایسے مسلمان ہیں جو قطر کی تعریفیں کر رہے ہیں کہ اس نے مغرب کے سامنے اسلام کا حقیقی رُوپ پیش کیا۔ اگر اس پس منظر میں باریک بینی سے غور کیا جائے تو ہمیں ان کی منافقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ تو آئیں اس پر غور کرتے ہیں!

مغرب کی قطر کو شرمندہ کرنے کی حقیقت

ورلڈ کپ کی میزبانی کرنے کے لحاظ سے قطر کے ایک انتہائی چھوٹا ملک[15] ہونے سے لے کر، ٹورنامنٹ سے متعلقہ تعمیراتی مقامات کے حالات[16]، ہم جنس پرست لوگوں کے خلاف ریاستی سطح پر امتیازی سلوک[17]، اور سٹیڈیم میں یا اس کے اطراف میں شراب پر پابندی[18] کی وجہ سے قطر کو شدید تنقید اور سوالات کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہی تمام مغربی ممالک اپنے اقتصادی و معاشی مراکز کو مزید رواں رکھنے اور عالمی نظام کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اس قطری ٹورنامنٹ کے تعمیراتی مقامات سے بھی بدتر حالات میں سستی اُجرت کے ذریعے نکالے گئے خلیجی تیل کو استعمال کرنے میں ملوث ہیں جو آج انسانی حقوق کا چیمپئن ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں۔

---

[15] https://www.espn.in/football/fifa-world-cup/story/4797079/sepp-blatters-comments-on-qatar-2022-world-cup-too-late

[16] https://www.theguardian.com/global-development/2022/nov/19/qatar-working-conditions-world-cup-guardian-reporting

[17] https://edition.cnn.com/2022/11/19/football/qatar-world-cup-2022-lgbtq-rights-spt-intl/index.html

[18] https://www.nytimes.com/2022/11/18/sports/soccer/world-cup-beer-qatar.html

یہی مغربی ممالک اس وقت تو گنگ بنے بیٹھے رہے تھے جب روس میں فیفا ورلڈ کپ منعقد ہو رہا تھا یا کیا پیوٹن کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے ریکارڈ[19] ان ممالک سے مخفی تھے؟ اور 2008 میں چین میں ہونے والے اولمپک کھیلوں کے دوران انہی مغربی ممالک نے کیوں کج روی اختیار کی تھی جبکہ چین میں آج بھی درسی کُتب میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ہم جنس پرستی دماغ کا خلل[20] ہے اور وہاں ہم جنس پرستوں کی باہمی شادی غیر قانونی[21] ہے؟ کیا چین کے ایغور کمیونٹی کے لوگوں کی چیخیں ان مغربی ممالک کے کانوں تک ابھی بھی نہیں پہنچی ہیں[22]؟ جرمن ٹیم، Die Mannschaft، نے اس وقت تو اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے تھے جب ان کے جاپان کے ساتھ ہونے والے ایک میچ سے پہلے ہونے والے گروپ فوٹو شوٹ میں فیفا کی جانب سے "OneLove" کا بازو بند باندھنے پر پابندی کی دھمکی کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا تھا لیکن اسی جرمن ٹیم نے اس وقت کوئی احتجاج نہ کیا جب ان کے سٹار پلیئر، Mesut Ozil کو چین کی جانب سے کئی دفعہ کھیل سے الگ رکھا گیا اور اس کی وجہ Mesut Ozil کا سنکیانگ میں ایغور مسلمانوں سے چین کے امتیازی برتاؤ پر تنقید کرنا تھا[23]۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ترکی نژاد تھا اور ٹیم کے لیے غیر ضروری تھا۔ کچھ یورپی ممالک کے شائقین نے قوس وقزح کے رنگ والی ٹوپیاں اور لباس پہننے کے اصرار پر سٹیڈیم کے داخلی دروازوں پر ہنگامہ کھڑا کر دیا[24]۔ یاد رہے کہ یہ وہی ممالک ہیں جو مسلم خواتین کو ان کے اسلامی لباس پہننے

[19] https://www.amnesty.org/en/location/europe-and-central-asia/russian-federation/report-russian-federation/

[20] https://www.scmp.com/news/people-culture/gender-diversity/article/3123549/homosexuality-can-be-called-mental-disorder

[21] https://www.nytimes.com/2015/11/25/world/asia/china-lgbt-rights-education-trial.html

[22] https://www.bbc.com/news/world-asia-china-22278037

[23] https://www.dailymail.co.uk/sport/sportsnews/article-7805497/Arsenal-star-Mesut-Ozil-removed-Pro-Evolution-Soccer-game-China.html

[24] https://www.washingtonpost.com/sports/2022/11/22/rainbow-flag-fifa-soccer-qatar/

کے انتخاب[25] پر پابندی اور جُرمانے عائد کرتے رہے ہیں اور اب وہ فیفا[26] سے اس مبینہ قطری مَن مانی[27] کی شکایت کر رہے ہیں۔ ایسے ممالک جنہوں نے خود تو اپنے ہاں تمباکو نوشی تک کے لیے خصوصی زون بنا رکھے ہیں اور وہ شراب کے نشے کی حالت میں کسی بھی قسم کی مشینری کو استعمال کرنے پر پابندی لگاتے ہیں، وہ ممالک بھی دوحہ کے اطراف میں شراب پینے کے لیے مخصوص علاقوں اور دوسرے لائسنس یافتہ مقامات[28] تک محدود ہونے پر قطر کی مذمت کر رہے ہیں۔ نام نہاد انسانی حقوق کی خلاف ورزی[29] کے اسی بھونڈے بہانے کو استعمال کرتے ہوئے کئی مشہور شخصیات نے ورلڈ کپ کی افتتاحی تقریب میں پرفارم کرنے سے انکار کر دیا۔ میڈیا کے بی بی سی جیسے بڑے اداروں نے دوٹوک انداز میں افتتاحی تقریب کو نظرانداز کر دیا اور اس کے بجائے قطر پر الزامات و تنقید نشر کرنے میں اپنا وقت صَرف کر دیا[30]۔ مغرب کے دوہرے معیار اور دوسروں کے قوانین و روایات کی تحقیر کو بے نقاب کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مثال یا واقعہ ہو سکتا ہے؟

قطر کی جانب سے اسلامی تاثر دینے کی اصلیت

[25] https://www.aljazeera.com/news/2021/9/24/muslim-women-struggle-with-germanys-hijab-ban-in-workplaces

[26] https://www.nytimes.com/2022/11/23/sports/soccer/german-player-protest-armbands-world-cup.html

[27] https://www.abc.net.au/news/2022-11-22/fifa-world-cup-qatar-rainbow-clothing-one-love-armband/101681732

[28] https://www.coventrytelegraph.net/news/uk-world-news/anger-sale-alcohol-fans-qatar-25548640

[29] https://time.com/6234015/celebrities-boycotting-qatar-world-cup/

[30] https://www.theguardian.com/football/2022/nov/20/bbc-ignores-world-cup-opening-ceremony-in-favour-of-qatar-criticism

ایک اور دلچسپ اور بہت زیادہ زیرِ بحث بات وہ اسلامی تاثر دینا ہے جو کہ قطر نے اس پروگرام، خاص طور پر افتتاحی تقریب کے دوران دینے کی کوشش کی۔ آج کل کے سوشل میڈیا کے اس دور میں سخت سے سخت تر ظالم حکمران بھی اپنی حکمرانی چھِن جانے سے ڈرتے ہیں اور اسی لیے اپنی رعایا کو مطمئن کرنے کے لیے ایسے اقدامات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اسلام سے ان حکمرانوں کی ظاہری محبت کے کھوکھلے پن کو سمجھنے کے لیے ذرا اس پر غور کریں۔ 1916 میں خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت[31] کرنے کے بعد، قطر عبداللہ ثانی کی قیادت تلے برطانوی حکومت کے زیرِانتظام آگیا۔ تب سے ہی الثانی خاندان اس چھوٹی سی سلطنت پر حکومت کرتا رہا ہے اور مختلف مواقع پر مسلمانوں کے خلاف مغرب کی مدد کرتا رہا ہے۔ العدید فضائی اڈا، جو کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا سب سے بڑا فوجی اڈا ہے، اس کی بہترین مثال ہے[32]۔ 1996 میں قطر نے اس فضائی اڈے کو 1 ارب ڈالر سے زائد کی لاگت سے تعمیر کیا تھا اور اس میں مستقل طور پر 11،000 امریکی اور امریکہ کی زیرِ قیادت anti-ISIL اتحادی افواج رہائش پذیر ہیں اور 100 سے زائد آپریشنل ہوائی جہاز موجود رہتے ہیں۔ اس فضائی اڈے کو امریکہ نے 2001 میں طالبان کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے استعمال کیا تھا اور دو دہائیوں پر محیط اس جنگ میں لاکھوں لوگ ہلاک ہوگئے تھے۔ افغانستان اور عراق کی تباہ کاریوں کی داستانوں میں بھی اسی فضائی اڈے سے اُڑنے والے برطانوی رائل فضائیہ اور رائل آسٹریلین فضائیہ کے جہاز اپنا حصہ ڈالتے رہے ہیں۔ فی الوقت، العدید اور قطر میں موجود دیگر اڈے، مختلف ممالک بشمول عراق، شام اور افغانستان[33] میں امریکی کاروائیوں کے لیے امریکی سینٹرل کمانڈ (CENTCOM) کے لیے نقل و حمل، کمانڈ اور بیس اڈے کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اسی طرح، قطر 1996 میں "اسرائیل" کی ریاست کے ساتھ اقتصادی تعلقات قائم کرنے والے پہلے عرب ممالک میں شامل تھا۔ قطر نے فٹبال ڈپلومیسی کا استعمال کرتے ہوئے اسرائیل کے ساتھ

[31] https://en.wikipedia.org/wiki/Battle_of_Al_Wajbah

[32] https://en.wikipedia.org/wiki/Al_Udeid_Air_Base

[33] https://militarybases.com/overseas/qatar/al-udeid/

اپنے تعلقات کو مزید معمول پر لانے کے لیے تل ابیب[34] سے "اسرائیلی" شائقین کے لیے براہِ راست پروازوں کا اعلان کر دیا۔ تاہم ابھی اُن کے عوام اس مسئلے پر حکومت کے ساتھ نہیں ہیں جیسا کہ قطر میں ورلڈ کپ کی کوریج[35] کے لیے "اسرائیلی" میڈیا کی بوکھلاہٹ اور اجتناب سے دکھائی دیتا ہے۔ اقتدار کی اندرونی کشمکش بھی شاید ایک اور وجہ ہے جس سے حکومت کھیلوں کے ذریعے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے اور اسی طرح دوسری وجہ الثانی خاندان کا شاہانہ طرزِ زندگی بھی ہے[36]۔ ان کی یہ شاہ خرچیاں پاکستانیوں میں خاص طور پر بدنام ہیں جو ان شاہی خاندانوں کو خصوصی طور پر تلور کے شکار کا اجازت نامہ دینے کا سُنتے رہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں مقامی لوگوں میں غم وغصہ پایا جاتا ہے[37]۔ اسلامی ثقافت اور قرآنِ کریم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ مسلمان مبلغین اور قطر کے علماء کی موجودگی سے ایک اچھی طرح مزّین کردہ افتتاحی تقریب، ان حکمرانوں کی جانب سے وہ ظاہری ڈھکوسلے ہیں جو وہ اسلام اور امت سے محبت کے اظہار کے لیے کر رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس ان کے عملی اقدامات بالکل اُلٹ ہیں اور ان حکمرانوں کے کھوکھلے بیانوں کا سارا پول کھول رہے ہیں۔ حقیقت میں قطر کے حکمران، شراب اور بے حیائی پر پابندی کا سہرا اپنے سَر لے ہی نہیں سکتے جس پر بہت سے بھولے بھالے اور معصوم مسلمان ان حکمرانوں کی تعریفوں کے پُل باندھ رہے ہیں۔ اصل میں ان حکمرانوں نے پہلے توفیفا کے مطالبات کے آگے سر جھکا دیئے تھے اور میچوں کے دوران سٹیڈیم کے اندر شراب کی فروخت پر رضامندی ظاہر کی تھی تاہم بعد میں اپنی عوام کی برہمی کے ڈر سے اس

[34] https://www.reuters.com/world/middle-east/direct-tel-aviv-doha-flights-operate-during-world-cup-fifa-2022-11-10/

[35] https://www.reuters.com/world/middle-east/arabs-shun-israeli-media-qatar-world-cup-dashing-hopes-warming-2022-11-21/

[36] https://www.therichest.com/luxury/a-peek-inside-the-extravagant-335-billion-life-of-the-qatari-royal-family/

[37] https://tribune.com.pk/story/1296854/qatar-royal-hunting-rare-houbara-bustard-attacked-balochistan

فیصلہ کو واپس لے لیا[38]۔ ہم جنس پرستوں LGBT کے حقوق سے متعلق بھی یہی معاملہ رہا ہے جس کے لیے قطری حکام نے فیفا کو یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ ورلڈ کپ کے دوران قطر کی نام نہاد "اخلاقیات" کا نفاذ لازمی نہ ہو گا۔ امیرِ قطر، شیخ تمیم بن حماد الثانی نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کو یہ بتایا کہ اس کی قوم "کسی قسم کے امتیازی سلوک کے بغیر... سب کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے گی"[39]۔ اسی طرح قطری حکومت نے سرکاری سطح پر اپنے آپ کو ڈاکٹر ذاکر نائیک کی موجودگی سے دور ہی رکھا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ انہیں سرکاری طور پر مدعو نہیں کیا گیا[40]۔

لیکن امت اب ان جھوٹے بیانات سے مزید بے وقوف نہیں بنے گی اور نہ ہی اب وہ جیت یا گول گننے میں مشغول رہے گی جبکہ ان کے حکمران مغربی طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ان کی دولت لوٹنے اور امت کو مزید غلامی میں دھکیلنے میں مصروف ہیں۔ (باقی دوسرے خلیجی ممالک کی طرح) قطر کی آمدن کا واحد ذریعہ وہ بے بہا زیرِ زمین ایندھن ہی ہے جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلم علاقوں کو نوازا ہے۔ مسلمانوں پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ قدرتی ذخائر مجموعی طور پر امت کی ملکیت ہیں[41] اور کسی کی ذاتی جاگیر نہیں ہیں کہ انہیں ایسے میلوں کی میزبانی پر ضائع کیا جائے۔ مزید براں ایسے ٹورنامنٹ مسلمانوں پر ان کی قومیت کی جھوٹی شناخت[42] کو مزید مشکل کر دیتے ہیں جو ویسے

---

[38] https://www.independent.co.uk/sport/football/world-cup/qatar-alcohol-stadium-ban-b2227933.html

[39] https://sports.yahoo.com/at-qatars-world-cup-lgbtq-fans-are-supposedly-welcome-but-still-afraid-163049856.html

[40] https://indianexpress.com/article/india/issue-zakir-naik-being-wanted-raised-with-qatar-mea-arindam-bagchi-8287907/

[41] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(المسلمون شركاء في ثلاث: في الماء والكلأ والنار)"مسلمان تین چیزوں میں شراکت دار ہیں: پانی، چراگاہیں اور آگ (توانائی کے ذرائع)"** (ابوداؤد)

[42] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(ليس منّا من دعا إلى عصبية، أو من قاتل من أجل عصبية، أو من مات من أجل عصبية) "وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف دعوت دے یا عصبیت کی خاطر لڑے یا عصبیت کی خاطر جان دے"** (ابوداؤد)

بھی استعماری آقاؤں کی جانب سے دیا گیا طوق ہیں۔ مغربی طاقتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے خود ہمیشہ میدانِ جنگ کا سہارا لیا ہے لیکن وہ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم انہیں فٹبال کے میدان میں ہرا دیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم انہیں کھیل کے لیے فٹبالیں[43] مہیا کر کے ہی خوش ہوتے رہیں جبکہ وہ خود دنیا کو مختلف اقسام کے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے کے ہتھیار مہیا[44] کرتے رہیں اور جمع[45] کرتے رہیں۔ ہمیں ٹورنامنٹ کے دوران ہونے والی بدتمیزیوں اور غنڈہ گردیوں پر اپنا غصہ نکالنے کی بجائے، اسلام کو اپنا معیار بنانے کی ضرورت ہے۔

نتیجہ

بہر حال اس ورلڈ کپ سے ایک مثبت نتیجہ اخذ کرنے کے طور پر ایک امید کی کرن یہ ہے کہ دنیا نے اس بات کا مشاہدہ کر لیا ہے کہ شراب اور بے حیائی پر پابندیاں قابلِ عمل ہیں اور جب ان شاءاللہ مستقبل قریب میں ایک مضبوط اسلامی ریاست اسلام کے نظام کے تحت یہ تمام پابندیاں نافذ کرے گی تو اس سے کوئی طوفان کھڑا نہیں ہو جائے گا۔

فہرست

[43] https://www.bloomberg.com/features/2022-world-cup-soccer-ball-adidas-al-rihla-sialkot

[44] https://www.statista.com/statistics/267131/market-share-of-the-leadings-exporters-of-conventional-weapons/

[45] https://ourworldindata.org/military-spending

شرعی احکام کا غلط نفاذ اسلام کو نقصان پہنچاتا ہے، اور لوگوں کو اسلام سے دور کرتا ہے

بلال المہاجر، پاکستان

افغان حکومت نے تمام غیر ملکی اور مقامی غیر سرکاری تنظیموں سے مطالبہ کیا کہ وہ ملک بھر میں خواتین کو کام کرنے سے روک دیں۔ افغان سیکیورٹی فورسز نے یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے خاتمے کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں کو بھی منتشر کر دیا۔ وزارت اقتصادیات نے تبصرہ کیا کہ اس نے دیکھا ہے کہ غیر ملکی اور مقامی اداروں میں خواتین ملازمین اسلامی حجاب اور امارت اسلامیہ کے قوانین کی پابندی نہیں کرتی ہیں۔

افغان حکومت نے اس سے قبل افغانستان بھر میں لڑکیوں اور خواتین کے لیے سرکاری اور نجی یونیورسٹیوں کو بند کرنے کا اعلان کیا تھا اور امریکہ نے اس فیصلے کی فوری طور پر مذمت کی۔ ایک حکومتی ذریعے نے الجزیرہ کو بتایا کہ طالبان تحریک کے رہنما، ہیبت اللہ اخندزادہ نے اعلیٰ تعلیم کی وزارت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ لڑکیوں کے لیے یونیورسٹیوں کو بند کرنے کے فیصلے پر عمل درآمد کرے۔ یہ فیصلہ گزشتہ موسم گرما میں طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد، لڑکیوں کے لیے مڈل اور ہائی اسکول بند رکھنے کے فیصلے کے بعد سامنے آیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانستان میں 40 سرکاری یونیورسٹیاں اور تقریباً 140 نجی یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے 68 دارالحکومت کابل میں ہیں۔ (الجزیرہ ڈاٹ نیٹ)

تقریباً 16 ماہ قبل امریکہ کے ساتھ اتفاق کرنے کے بعد کہ وہ، طالبان تحریک، اشرف غنی حکومت کے خاتمے کے بعد اقتدار سنبھالے گی، تحریک نے کسی ایسے نظامِ حکومت کا اعلان نہیں کیا، جس میں وہ تفصیلات موجود ہوں جس کے ذریعے تحریک ملک میں حکومت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ نتیجتاً، ملک کبھی ایک سمت تو کبھی دوسری سمت میں جاتا ہے اور لوگ اس طرز حکمرانی کی نوعیت کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔۔۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہو رہا ہے کہ طالبان کی تحریک نے اسلام، اسلام کی حکمرانی اور امارت اسلامیہ کا نعرہ بلند کیا تھا۔ تاہم، اس نے اسلام کے کافی حصے کو نافذ نہیں کیا۔ اس نے نظام حکومت سے متعلق شرعی احکام کا اطلاق نہیں کیا جو خلیفہ کی بیعت پر مبنی ہے۔ اس نے امارت اسلامیہ کا خلافت کے طور پر اعلان نہیں کیا جو قرآن اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق اسلام نافذ کرتی ہے اور امت کے امور کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

اس کے بجائے طالبان کی تحریک نے مغربی طرز پر ایک سول ریاست بنائی جس میں وزراء اور سفیر وغیرہ شامل ہیں۔اس نے اسلام کے معاشی نظام کو بھی لاگو نہیں کیا جو ملکیت کو انفرادی ملکیت، ریاستی ملکیت اور عوامی ملکیت میں تقسیم کرتی ہے۔اس کے بجائے، اس نے کچھ معاملات میں رسمی تبدیلی کے ساتھ اشرف غنی کے دور کے مالیاتی لین دین اور معیشت کے نظام کو برقرار رکھا۔

طالبان تحریک کی جانب سے جو سب سے نمایاں قوانین نافذ اور طرز عمل لوگوں کے سامنے اسلام کی حکمرانی قائم کرنے کے طور پر پیش کیے گئے، وہ خواتین سے متعلق تھے۔ان میں خواتین کو یونیورسٹیوں میں جانے، کمپنیوں اور میڈیا میں کام کرنے سے روکنے والے قوانین شامل تھے۔ یہ قوانین بظاہر شرعی قانون نظر آئیں، لیکن جس طرح ان کا اطلاق ہوتا ہے وہ شرعی نہیں ہے۔مثال کے طور پر عوامی زندگی میں حجاب کا مطلب خواتین کو گھروں سے نکلنے سے روکنا نہیں ہے۔اس کے بجائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کو بغیر حجاب کے گھر سے باہر جانے سے روکا جائے۔ یونیورسٹیوں میں مرد و خواتین کا آزادانہ اختلاط (میل جول) کو روکنے کا مطلب یہ نہیں کہ خواتین کو یونیورسٹی کی تعلیم روک دیا جائے۔اس کے بجائے، یہ حکم یونیورسٹیوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ تعلیمی کلاسوں میں مردوں کو عورتوں سے الگ کریں، یعنی نماز کی صفوں کے طریقہ کار کی پیروی کرتے ہوئے کلاسز کا اہتمام کریں، یعنی مرد اگلی صفوں میں اور خواتین پچھلی صفوں میں بیٹھیں، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شرعی لباس کے ضابطوں کی پابندی کریں۔ یہی حکم عوامی زندگی میں خواتین کے کام پر بھی لاگو ہوتا ہے۔اختلاط یا اسلامی لباس کے ضابطوں کی پابندی نہ کرنے یا اسی قسم کے کسی بھی دوسرے جواز جو بہانہ بنا کر خواتین کو کام کرنے سے روکنے کی اجازت نہیں ہے۔اس کے بجائے، قانون نافذ کر کے اور غلط طرز عمل کی نگرانی کر کے، خواتین کو کام کرنے کی اجازت دی جائے، اور جو قانون کی خلاف ورزی کریں ان کا احتساب کیا جائے، چاہے وہ چند ہی کیوں نہ ہوں۔چند لوگوں کی جانب سے قانون کی خلاف ورزی کرنے یا غلط طرز عمل اختیار کرنے کا جواب یہ نہیں ہے کہ تمام خواتین کو کام کرنے سے روک کر اجتماعی سزا دی جائے بلکہ اسلامی قوانین کے بھرپور نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔

معاشرے میں اسلام کا مکمل نفاذ فرض ہے۔اس کا مکمل نفاذ وہ ہے جو معاشرے کے اندر اعتماد قائم کرے۔اسلام کے بعض احکام کا نفاذ، اور بعض کا عدم نفاذ، معاشرے کو ایک یکساں اسلامی معاشرہ نہیں بناتا۔ اس کے علاوہ بعض شرعی احکام کا مسلمانوں پر غلط طریقے سے نفاذ خود اسلام کے خلاف منفی رد عمل پیدا کرتا ہے۔درحقیقت یہی کچھ پڑوسی ملک ایران میں ہوا،

جہاں شرعی احکام کی من مانی تاویل اور اُن کے غلط استعمال نے بہت سے لوگوں خصوصاً خواتین کے اسلام کے خلاف تعصب کا براہ راست سبب بنا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ وہ جو ان احکام کا غلط استعمال کرتے ہیں، اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں، جبکہ ان کے علمائے کرام ان کے شرعی جواز پر فتویٰ جاری کرتے ہیں۔ اُن کی جانب سے احکام کے غلط استعمال کو عام لوگ اسلام کا نفاذ سمجھتے ہیں، جو اسلام اور سیاسی کھیل سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا، عام لوگ اسلام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ حکام کے طرز عمل سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہی صورتحال ایران میں مظاہروں کے پھیلنے اور ان کے جاری رہنے کی ایک وجہ تھی۔ مزید برآں، شاید، خواتین کی یونیورسٹیوں میں جانے پر پابندی کی مذمت کرنے میں امریکہ کی جلد بازی کا مقصد طالبان تحریک کو اپنے فیصلے پر اڑے رہنے کے لیے دباؤ ڈالنا تھا۔ اس طرح لوگوں میں اسلام کے حکم کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی گئی۔

ایسا لگتا ہے کہ امریکہ، جس نے خمینی کو اقتدار میں لانے میں مدد فراہم کی تھی، اور افغانستان میں طالبان تحریک کے لیے اقتدار میں آنے کے لیے دروازے کھول دیے تھے، ایرانی تجربے کو افغانستان میں دہرانا چاہتا ہے۔ یہ طریقہ کار خمینی انقلاب کے بعد لوگوں میں اسلام کے خلاف عدم اطمینان کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان (ایران) پر حقیقی اسلام کی حکمرانی نہیں ہے، بلکہ ملاؤں کے فرقے کی حکمرانی ہے، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرز عمل نے لوگوں کو دکھی کیا، ان پر ظلم کیا گیا اور ان کو مفلس کر دیا گیا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اسلام کی حکمرانی سے متنفر اور دور ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکہ افغانستان میں ایرانی تجربے کو دہرانا چاہتا ہے، اس طرح اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ مسلمان اسلام کی حکمرانی کا مطالبہ نہ کریں، جبکہ جو لوگ اسلام کی حکمرانی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ غیر منصفانہ، جاہل یا غیر معقول نظر آنے لگ جائیں۔ کیا طالبان نے اسلام کے خلاف صلیبی جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا ہے؟! اور کیا طالبان کی تحریک کو مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ان مخلصین کے سامنے رکاوٹ بن جائے جو نبوت کے نقش قدم پر خلافت کے دوبارہ قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؟! طالبان تحریک کے مخلص اور سمجھدار لوگوں کو اپنے معاملات کو درست کرنا چاہیے، اپنے رہنماؤں کا احتساب اور اُن کے ہاتھ پکڑنا چاہیے، جنہوں نے دانستہ یا نادانستہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔ اور انہیں ملک کی قیادت حزب التحریر کے مخلص افراد کے حوالے کرنی چاہیے جنہوں نے مکمل طور پر، شفاف، خالص اور عدل کے ساتھ حقیقی اسلام کی حکمرانی کے لیے مکمل تیاری کر رکھی ہے۔

فہرست

نفسانی خواہشات کا مقابلہ

ہم نے اکثر اپنے کانوں میں شیطان کی سرگوشیاں سُنی ہوں گی جب وہ ہمیں راہِ حق سے بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔ایسی سرگوشیاں اور وسوسے مثلاً "صرف ایک بار..."، "صرف ایک بار سے تو کچھ نہیں ہوتا..."، "تم ابھی بھی ایک اچھے انسان ہو..."، "اللہ بہت معاف کرنے والا (الغفور الرحیم) ہے"۔

ہم کتنی بار ایسے الفاظ سُن چکے ہیں؟ چاہے وہ ہمارے دوستوں، جاننے والوں، خاندان والوں کی طرف سے ہوں یا پھر جیسے کسی نے ہمارے ذہن میں ڈال دیا ہو۔ کیا یہ صرف اتنی سادہ سی بات ہے یا پھر واقعی ایک بار ہے؟ "صرف ایک جھوٹ"، "صرف ایک نظر"، "صرف ایک کلِک"، "صرف ایک بار"۔ لاحولَ ولا قوۃ الا باللہ!

یہ تین سادہ سے الفاظ "صرف ایک بار"، ہماری دُنیا اُلٹ سکتے ہیں۔

یہ کہنا کہ:

"شاید یہ کوئی اتنی بھی بڑی بات نہیں ہے، میرا مطلب ہے آؤ یار... بس صرف ایک نظر، استغفر اللہ"۔

"ایک زوردار تالی! یار میرا مطلب ہے ہم کوئی ہاتھ تو نہیں پکڑ رہے"۔

"یار! بس ایک چھوٹا سا سفید جھوٹ ہی تو ہے، اس سے اب تم جھوٹے تو نہیں بن جاؤ گے، لیکن یہ بہتر ہے کہ اُن کو کچھ پتا نہ چلے"۔

"ہائے دیکھو! وہ شراب پی رہا ہے... لیکن اُسے معلوم تو ہے ہی کہ یہ حرام ہے، لیکن مجھے اِس سے کیا، میں کسی کے معاملے میں کیوں پڑوں"۔

"دیکھو میں کتنی پیاری لگ رہی ہوں،... کیا ہی بہتر لگے گا کہ بغیر حجاب کے ہی چلی جاؤں!"۔

"ایک معمولی سی سرگوشی کی خیر ہے، یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی"۔

"کوئی بھی گھر پر نہیں ہے، کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا، بس ایک کلِک ہی تو دبانا ہے"۔

"وہ صبر کرلیں گے! فکر کی بات نہیں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اُنہیں کیسے کنٹرول کرنا ہے!"۔

خیالات ...بہانے ... بہلاوے ... وسوسے ... لالچ!

آج کل کے دَور اور زمانے میں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت سادہ اور آسان لگتی ہیں جو ہم اپنے زمانے میں شاید کبھی سوچ بھی سکتے تھے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مسلمان ہماری سوچ سے زیادہ خطائیں کر رہے ہیں اور یقیناً جو ہو رہا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ سوچ کہ جو ہم کر رہے ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے، یا اس کا ہم پر یا کسی دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، یا اس کا ہم پر پہلے ہی کوئی اثر نہیں پڑ رہا تو اب کیا پڑے گا، اور یہ سوچنا کہ اللہ تو الغفور الرحیم ہے۔

غور کریں، جس حقیقت کی طرف ہم زیادہ توجہ نہیں دیتے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک نظر، وہ دانستہ ڈالی گئی ایک نظر چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے، ہم پر کسی نہ کسی طرح اثر کرتی ہے۔ کیونکہ وہ دانستہ نظر، شیطان کے لئے ہمارے نفس کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ یہ ہمیں ایک درجہ نیچے لے جاتی ہے اور اگلی بار جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ شیطان کے لئے قدرے آسان ہوتا ہے اور اس سے اگلی نگاہ مزید آسان اور پھر ایک اور نگاہ، اور یوں یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ وہ معمولی سی اُچٹتی ہوئی نگاہ ہمیں اندر سے مَیلا کر دیتی ہے اور ہمارے خالص اور سچے دل پر ایک کالا دھبّہ چھوڑ جاتی ہے۔

ہاں بے شک، اللہ سبحانہ وتعالیٰ الغفور الرحیم ہیں، لیکن وہ شدید العقاب بھی ہیں، یعنی سزا دینے میں بہت سخت۔ صحابہ کرامؓ سے جنت کا وعدہ کیا گیا تھا مگر اس کے باوجود بھی ان کی نیتوں اور اعمال کو پرکھا گیا۔ ہم آج جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں وہ ہمارے لئے جانچنے کا معیار نہیں ہونا چاہئے کہ جس سے ہم اعمال کا موازنہ کر سکیں، کیونکہ چھوٹے سے چھوٹا

عمل بھی ہمیں جنت میں لے جاسکتا ہے اور بالکل اسی طرح، یقیناً چھوٹے سے چھوٹا عمل جہنم کی آگ میں بھی لے جا سکتا ہے!

اللہ سبحانہ وتعالیٰ بہت رحیم ہیں اور ان شاءاللہ ہم پر رحم کریں گے ...رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ تَعَالَى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ إِمَامٌ عَدْلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللَّهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَرَجُلاَنِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»

"سات قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن اللہ اپنے سائے میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا: عادل حکمران، وہ نوجوان جس کی پرورش اللہ عزوجل کی عبادت میں کی گئی، وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے، وہ دو لوگ جو محض اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اللہ کی خاطر جدا ہوتے ہیں، وہ شخص جسے اعلیٰ خاندان کی خوبصورت عورت (زنا کی) دعوت دے اور وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، وہ شخص جو مخفی طور پر یوں صدقہ دے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی یہ پتہ نہ چلے کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے اور وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر جائیں"۔

جب ہم کوئی نافرمانی کرتے ہیں تو غور کریں کہ ہم اُس پروردگارِ عظیم کی نافرمانی کر رہے ہیں جو اگر پکڑ کرے تو اپنے بندوں کے کسی "چھوٹے" سے گناہ پر بھی سزا دے سکتا ہے اور اگر مغفرت کر دے تو بڑے بڑے کبیرہ گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمارے دِلوں کے احوال جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ہمارے اعمال کو بھی دیکھتے ہیں، جن اعمال کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور جن اعمال سے منع فرمایا ہے اور وہ منع کیے گئے اعمال اگر سرزد ہو جائیں تو ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رحم و کرم سے دور لے جاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۖ وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴾

"جب تم اس کو اپنی زبانوں پر لینے لگے اور اپنے منہ سے بولنے لگے، جس چیز کی تم کو خبر نہیں، اور تم اس کو ہلکی بات سمجھتے ہو، اور یہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے" (النور: 15)۔

کبھی کبھار کچھ غلط یا نقصان دہ بات پر ہم اس لیے خاموش ہو جاتے ہیں کہ ہم اعمال کو بہت چھوٹا اور غیر اہم سمجھتے ہیں۔ جب ہر کسی کو حق ہے کہ وہ جو جی چاہے کرے، تو ہم کون ہوتے ہیں اس سے پوچھنے والے؟ یہ کیسی نام نہاد آزادی ہے؟۔ یہ تو صاف واضح ہے، ہم چاہے ان سے اتفاق نہ بھی کرتے ہوں لیکن ہم پھر بھی خاموش رہتے ہیں یا پھر ہم یہ سوچتے ہوئے ان کے حق میں ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ جیسے وہ معمولی اور غیر اہم سے الفاظ ہیں، یہ سوچتے ہوئے کہ اللہ دِلوں کا حال جانتا ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہم اُس وقت کتنے دباؤ میں تھے۔ وہ یقیناً ہمیں معاف کر دے گا، یہ کہہ کر ہم اپنے آپ کو تسلی دے دیتے ہیں۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے طائف میں بہت نفرت اور سخت تکلیف تک کا سامنا کیا حتیٰ کہ آپ ﷺ پر پتھر بھی برسائے گئے، رسول اللہ ﷺ وہاں کھڑے رہے اور کوئی بھی آپ ﷺ کے ساتھ نہ تھا۔ ہمارے پیارے نبی، محمد ﷺ بہت ثابت قدم تھے، اس یقین کے ساتھ، کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ ﷺ کے ساتھ ہیں اور آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے اور آپ ﷺ کو مضبوط کر دیں گے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے:

﴿ أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴾

"بھلا کون بیقرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اسکی) تکلیف کو دور کرتا ہے، اور تم کو زمین پر نائب کرتا ہے؛ اب کوئی ہے حاکم اللہ کے ساتھ؟ تم سوچ کم کرتے ہو" (النمل: 62)۔

ہر نفسانی خواہش، ہر آزمائش کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں حل فراہم کیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو مضبوط کریں اور پہلی بار میں ہی اس کا شکار ہونے سے محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزہ رکھنے کا حکم دیا تاکہ ہماری نگاہیں نیچی رکھنے میں ہماری مدد ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شراب کو ہاتھ میں پکڑنے اور چھو کر دیکھنے سے بھی منع کیا یا ایسی کسی میز پر بیٹھنے سے بھی جس پر شراب پی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دوست بنانے میں بھی محتاط رہنے کا حکم دیا۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب اسلام پر چلنا ایسے ہو گا جیسے ہاتھ میں گرم انگارہ پکڑنا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« يأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ الصَّابِرُ فِيهِمْ عَلَى دِينِهِ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ »

"لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب ان میں کسی کیلئے اپنے دین پر کاربند رہنا ایسا ہو گا کہ گویا اس نے دہکتے ہوئے انگارے کو مٹھی میں پکڑ رکھا ہو"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ سچی توبہ قبول کریں گے اور ہمیشہ رحم کا معاملہ کریں گے اور جب ہم اپنے آپ کو تبدیل کرنا چاہیں اور اپنے رب سے سچے خلوص کے ساتھ رحم کی التجا کریں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ آج کا دور اور زمانہ آسان نہیں ہے۔ یہی مؤمنین کی دُنیا ہے! ہمیں اپنی آخری سانس تک بھی آزمائے جانے کے لئے تیار رہنا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھیں اور اُسی پر بھروسہ رکھیں یا اپنی خواہشات و آرزوؤں کے آگے گر جائیں اور ان کے نتائج ہمیں نِگل جائیں جن کا ہم اس دُنیا اور اگلے جہان میں سامنا کریں گے۔

اس اُمت میں قیامت تک نیکی و خیر رہے گا! اس اُمت میں ایسے مرد و عورت آخر تک موجود رہیں گے جو اپنے رسول محمد ﷺ سے مخلص و وفادار ہوں گے۔ نوجوان مرد اور عورتیں جو اسلام کی دعوت کا بار اپنے کاندھوں اور پیٹھ پر لیے فخر سے اسے پُوری دُنیا تک لے کر جائیں گے! اور اپنے اس پیغام پر فخر کریں گے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرمانبردار

بندے بننے کا فخر !۔ یہ نوجوان کبھی کسی کے آگے نہیں جھکیں گے، سوائے نماز ادا کرنے کیلئے۔ وہ کبھی اس دُنیا کی چاہت میں گرفتار نہیں ہوں گے اور اگر وہ پھِسل بھی گئے تو وہ واپس لوٹیں گے اور چٹانوں کو بھی اپنے قدموں میں جھکا لیں گے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کرنے کے لئے اور اُس خالق کی ہمیشہ رہنے والی جنت کو پانے کے لیے آئے ہیں جس کی وہ اس عارضی دنیا میں موجود چاہتوں سے کہیں زیادہ چاہت رکھتے ہیں ! وہ ایک ایسی نسل ہوں گے جنہیں ان مشکل حالات میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہر طرح کی بُرائی کے خلاف ہمت و حوصلہ عطا کیا جائے گا۔ ایک ایسی نسل جو نیکی کی ترغیب دے گی اور برائی سے منع کرے گی۔ ایک ایسی نسل جِسے سیدنا ایوبؑ کا صبر اور سیدنا یوسفؑ کی نفسانی مضبوطی عطا کی جائے گی۔

ایک ایسی نسل جس کا ایک مقصد ہو گا

ہاں یہ درست ہے کہ ہم مادی و نفسانی خواہشات میں گھِر سکتے ہیں ... لیکن ہمیں یاد رکھنا ہے کہ ہم ان عظیم اور زبردست، مضبوط ارادے والے، صابر مؤمنین کے ورثائ تھے اور ہیں، جنہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسلام کے خلاف ہونے والے تمام تر اقدامات و صعوبتوں کے باوجود اس قدر حوصلہ دیا تھا کہ وہ اسلام کی دعوت کو تمام جہانِ عالم تک لے جا سکیں۔ تو یہاں پر سوال یہ ہے کہ ... کیا آپ بھی دعوت کے ان علمبرداروں میں ہوں گے ؟

فہرست

پاکستان کی ضرورت ایک نئی سیاست اور نئی ریاست کا قیام ہے، جس کی بنیاد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی وحی ہو اور یہ صرف خلافت کے قیام کے ذریعے ممکن ہے

حزب التحریر ولایہ پاکستان

گزشتہ چند سالوں میں معاشی ابتری کی وجہ سے پاکستان کے مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی افراتفری، عدم استحکام اور گورننس کی ناکامی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پاکستانی ریاست اور اس کے ادارے عوام کو درپیش مسائل سے لاتعلق نظر آتے ہیں، مسائل کے حل میں ان کی عدم دلچسپی واضح ہے بلکہ ریاست تو گویا غائب ہے یا اس کا وجود ہی موجود نہیں، جس کے نتیجے میں عوام کی مشکلات شدید تر ہو چکی ہیں۔

آج پاکستان کا سیاسی طور پر مفلوج ہونا اور عدم استحکام اُس ناکام طرزِ سیاست کا براہ راست نتیجہ ہے، جو حکمران طبقہ کا خاصہ ہے۔ پی ٹی آئی، مسلم لیگ ن، پی پی پی اور دیگر سیاسی جماعتیں اپنی طرزِ سیاست میں سیاست کے متعلق مغرب کے تصور سے متاثر ہیں، نتیجتاً اُن کی سیاسی کوششوں کا تمام تر محور ہر قیمت پر اقتدار کا حصول اور حکومتی سیاستدانوں، جرنیلوں اور اعلیٰ عدلیہ کے مفادات کا تحفظ ہے۔ سویلین بالادستی، قانون کی بالادستی اور عوام کی حکمرانی جیسے نعروں کے نام پر کی جانے والی یہ سیاست، جرنیلوں، سیاست دانوں اور ججوں کے مفادات کو پورا کرنے کے گرد گھومتی ہے جو طاقت کے حصول اور ملکی وسائل میں زیادہ سے زیادہ حصہ وصول کرنے کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ یہ سیاسی سودے بازی کرنے، مغربی مفادات اور بین الاقوامی اداروں کی خدمت کرنے اور ایسے قوانین منظور کرانے کی سیاست ہے، جس کے نتیجے میں جرنیلوں، سیاست دانوں اور ججوں کی مدتِ ملازمت یا اقتدار میں توسیع ہو یا ان کو ملنے والی مراعات میں اضافہ ہو، اور سیاسی جماعتوں کے وفاداروں اور ان کی مالی معاونت کرنے والوں کو نوازا جائے۔

پاکستان کے مسلمانوں کی بدحالی کو ختم کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی آپشن نہیں کہ موجودہ سیاست، جو طاقت واقتدار کی ہوس کی بنیاد پر کھڑی ہے، کو مکمل طور پر مسترد کر دیا جائے اور اسلام پر مبنی نئی سیاست کو اپنایا جائے۔

پاکستان کو ایک نئی سیاست کی ضرورت ہے جس کا محور و مرکز عوام کے امور کی دیکھ بھال ہو۔ ایک ایسی سیاست جو اسلامی شریعت کے نفاذ پر مبنی ہو، جس میں حکمران قرآن اور سنت نبوی ﷺ سے اخذ کردہ احکامات کو نافذ کریں، اور امت اسلام کے نفاذ میں کوتاہی پر حکمران کا کڑا احتساب کرے۔ ایسی سیاست جو امت کے مفادات کو اسلامی شریعت کی روشنی میں دیکھے اور جو امت کو کافر استعمار کے مکر و فریب سے محفوظ رکھے۔ ایک ایسی سیاست جس کا محور امت کے معاشی وسائل کو یکجا کر کے تمام مسلمانوں پر خرچ کرنا ہو۔ ایک نئی سیاست جو مقبوضہ فلسطین اور کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے امت کی فوجی قوت کو یکجا کرنے کے لیے عملی اقدامات اٹھانے کا مطالبہ کرے۔ ایک ایسی سیاست جو پوری دنیا تک اسلام کے پیغام کو پہنچانے پر اپنی توجہ مرکوز کرے اور جو ایسے حکمران پیدا کرے جو امت کے محافظ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالأَمِيرُ رَاعٍ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ،وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ "تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کے بارے میں سوال ہو گا کہ جس پر وہ نگہبان تھا۔ حکمران نگہبان ہے، مرد اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر نگہبان ہے۔ پس تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کے بارے میں سوال ہو گا کہ جس پر وہ نگہبان تھا"۔** (بخاری)

پاکستان کو نئی سیاست کے ساتھ ساتھ ایک نئی ریاست کی ضرورت ہے۔ جمہوریت، جو کہ مغرب کا سیاسی نظام حکومت ہے اور پاکستان میں بھی نافذ ہے، موجودہ سیاست دانوں کو اپنے اور اپنے مغربی آقاؤں کے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے قانون بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ جمہوریت میں اثر ورسوخ رکھنے والے کاروبار، ذاتی مفاد کے حصول کے لیے قانون سازی کے عمل اور سرکاری محکموں پر اثرانداز ہوتے ہیں، اور ایسے قوانین اور پالیسیاں بنواتے ہیں جن سے سرمایہ دار کو رعایتیں اور چھوٹ حاصل ہوتی ہے۔ وفاقی، صوبائی اور بلدیاتی حکومتوں پر مشتمل تہہ

دار فیڈرل ریاستی ڈھانچہ فیصلہ سازی اور پالیسی سازی کو مفلوج کر دیتا ہے۔ صوبائی اور مقامی حکومتیں مختلف سیاسی جماعتوں کے زیر انتظام ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو اور وفاقی حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ طاقت کی یہ تہہ دار تقسیم، حکومت کے تمام ڈھانچوں میں موجود حکمران طبقے کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ کوتاہی و غفلت کا ملبہ ایک دوسرے پر ڈال کر اپنے آپ کو امت کے معاملات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سے بری الذمہ بنالیں۔ پنجاب کے وسائل سندھ کے سیلاب زدہ مہاجرین کے لیے دستیاب نہیں، جبکہ وفاقی حکومت سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے سیلاب زدہ مہاجرین کی مدد نہیں کر رہی کیونکہ حکمران مسلم لیگ (ن) ان سیلاب زدہ مہاجرین کو اپنے ووٹرز کے طور پر نہیں دیکھتی۔ ہر پانچ سال بعد انتخابات، اور حکومتوں اور قانون ساز اسمبلیوں کو تحلیل کرنے کے حق نے پاکستان میں مسلسل سیاسی عدم استحکام پیدا کر رکھا ہے، جو ریاست کو مفلوج کر رہا ہے۔ خارجہ امور میں پاکستانی ریاست مسلسل غیر ملکی طاقتوں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے قرضوں پر انحصار کرتی ہے، جو پاکستان کی اقتصادی اور خارجہ پالیسی کو غیر ملکی طاقتوں کے تابع بنانے کے لیے سخت معاشی اور سیاسی شرائط عائد کرتے ہیں۔

نئی ریاست، یعنی نبوت کے نقشِ قدم پر قائم دوسری خلافتِ راشدہ میں امت تاحیات خلیفہ کا انتخاب کرتی ہے اور اسے اس شرط پر بیعت دیتی ہے، کہ وہ امت کی اطاعت کے بدلے میں اسلامی شریعت کو نافذ کرے گا اور جہاد کرے گا۔ خلیفہ کو اس صورت میں ہٹایا جاتا ہے اگر وہ قطعی کفریہ قوانین کا نفاذ شروع کر دے، یعنی اس سے 'کفرِ بواح' ظاہر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت میں سیاسی استحکام رہتا ہے اور خلیفہ کو امت کی بہتری کے لیے طویل مدتی پالیسیاں بنانے اور ان پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خلیفہ ہی صوبوں کے والی (گورنروں) اور شہروں کے عامل مقرر کرتا ہے۔ والی اور عامل خلیفہ کو رپورٹ کرتے ہیں جبکہ خلیفہ اپنی کارکردگی کے حوالے سے امت کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ خلافت ریاست کے تمام شہریوں کو ان کی نسل، رنگ یا سیاسی طاقت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلامی شریعت کے مطابق حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ خلیفہ قانون نہیں بنا سکتا، وہ محض اسلامی شریعت کا پابند ہوتا ہے اور اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ قرآن اور سنت نبوی ﷺ سے اخذ کردہ قوانین کو ہی نافذ کرے۔ اسلام مسلمانوں کو کفریہ قانون کی بنیاد پر

قائم اتھارٹی کی اطاعت سے منع کرتا ہے، اسی لیے ریاستِ خلافت کو بین الاقوامی اداروں کا حصہ بننے کی اجازت نہیں ہے، چاہے وہ ادارے سیاسی ہوں یا مالیاتی، کیونکہ ان میں کفار کو مسلمانوں کے امور پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ اور اسلام نے مسلمانوں کو جنگی معاملات میں کفار سے مدد لینے سے سختی سے منع کیا ہے۔ یہ نئی ریاست، یعنی دوسری خلافتِ راشدہ، وحی کی بنیاد پر ہم پر حکومت کرے گی، اور قرآن وسنت میں دیے گئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نازل کردہ قوانین اور پالیسیوں کو نافذ کرے گی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا، **وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ "اور (ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ) جو (حکم) اللہ نے نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق ان میں فیصلہ کرنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں آپ کو بہکا نہ دیں"** (المائدہ، 5:49)

خلافت اسلام کا سیاسی ڈھانچہ ہے۔ امت کے لیے تین دن اور تین راتوں سے زیادہ خلیفہ کے بغیر رہنا جائز نہیں۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ خلیفہ کو مقرر کریں، اس کی اطاعت کی بیعت کریں اور اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلام کے پیغام کو پوری دنیا تک پہنچانے کے لیے جہاد میں اس کی مدد کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ. قَالُوا فَمَا تَأْمُرُنَا قَالَ فُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ "بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے بلکہ کثیر تعداد میں خلفاء ہوں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کی اطاعت کرو جسے سب سے پہلے بیعت دی جائے اور انہیں اُن کا حق ادا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کی رعایا کے بارے میں پوچھے گا جو اُس نے انہیں دی"۔** (بخاری)

اے افواج پاکستان کے افسران!

اللہ کے رسول ﷺ نے انسانیت کے سامنے ایک نیا نظریہ پیش کیا، جس کی بنیاد رب العالمین کی جانب سے نازل کی گئی وحی تھی۔ آپ ﷺ نے ایک نئی سیاست، ایک نئی ریاست اور ایک نیا معاشرہ قائم کیا جو پوری دنیا کے لیے روشنی کا مینار بن کر چمکا۔ تاہم، اس مشن میں انصار کے مبارک لوگوں نے آپ ﷺ کی مدد کی جو فوجی طاقت اور قوت کے حامل تھے، جنہوں نے پہلی اسلامی ریاست کے قیام کے لیے نُصرۃ دی اور اپنی طاقت کو اسلام کے نفاذ کے لیے پیش کیا۔ آج یہ شرعی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے۔ مسلم دنیا کے لیے ایک نئے وژن کی خاطر اپنا عسکری تعاون (نُصرہ) پیش کریں۔ نبوت کے نقشِ قدم پر دوسری خلافتِ راشدہ کے قیام کے لیے نُصرۃ کی بیعت دے کر اپنے رب کی خوشنودی سمیٹ لیں اور دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کریں۔

29 جمادی الاول 1444 ہجری

23 دسمبر 2022ء

حزبُ التَّحریر

ولایہ پاکستان

فہرست

دین کی تجدید

یوسف الساریسی-بیت المقدس

اللہ تعالی نے انسانی معاشروں کی زندگی میں کچھ قوانین اور روایات مقرر کی ہیں جو ان کو فاسد ہونے سے بچاتے ہیں جیسے لوگوں کے درمیان زمانوں کے تبدیل ہو جانے کا قانون، نافرمانوں اور جابروں کی جلد از جلد تباہی کا قانون اور عروج تک پہنچنے کا قانون جس تک صرف فکر کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے، وغیرہ۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالی نے مسلم امت کے لیے قوانین مقرر کیے ہیں جو دین اسلام کی بقا اور حفاظت کے ضامن ہیں، جن سے اللہ کا یہ آخری دین ہی ایک صحیح اور مناسب دین ہو گا جو ہر زمان و مکان کے لیے مناسب ہو گا، اور تمام ادیان اور آئیڈیالوجیز پر غالب آئے گا۔

یہ امتِ مسلمہ پر اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے کہ اللہ نے قرآن اور اس دین کی تحریف سے حفاظت کی ذمہ داری خود لی۔ اس کیلئے اللہ سبحانہ وتعالی نے اس امت میں ہر زمانے میں حق پر ڈٹا رہنے والا ایک گروہ پیدا کیا۔ جو بھی حق کا متلاشی ہو گا وہ اس طرح کے گروہ کو پالے گا، اس لیے کوئی زمانہ حق کے داعیوں سے خالی نہیں ہوتا، ان سے جو لوگوں کو حق بات بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں پر اللہ کی یہ نعمت بھی ہے کہ ان کے دین کی حفاظت کے لیے ہر سو سال بعد اللہ سبحانہ وتعالی ایک ایسے شخص کو بھیجتے ہیں جو اس امت کے لیے ان کے دین کی تجدید کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا ہے جس کو ابو داود نے روایت کیا ہے: **«إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها» "اللہ اس امت کے لیے ہر صدی کی ابتدا میں اس شخص کو بھیجتا ہے جو اس امت کے لیے اس کے دین کی تجدید کرتا ہے"**۔ یوں یہ مجدد دین کی تجدید کرتا ہے اور اسلام کے صحیح فہم کو بیان کرتا ہے، جو اس دین میں سے نہیں تھا مگر اس میں شامل کر دیا گیا تھا اس کو اسلام سے زائل کرتا ہے، وہ مسلمانوں کو درپیش بڑے مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں پر اللہ کی سب سے بڑی نعمتوں

میں سے ہے، اس کا فضل اور مہربانی ہے؛ اس سے یہ دین آخری دین ہونے کی حیثیت سے قیامت تک زمانوں کے لیے حجت رہے گا اور اسلامی امت باقی امتوں پر گواہ رہے گی۔

یہاں اس سوال کا پیدا ہونا لازمی ہے کہ دین کو تجدید کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس کو لوگ اپنی زندگیوں میں نافذ کرتے ہیں، جس میں وہ قوانین موجود ہیں جو اسلام کے افکار اور احکامات کی اس امر سے حفاظت کرتے ہیں کہ ان کے نفاذ میں کوتاہی اور حدود سے تجاوز نہ ہو، جس میں پیش آنے والے وہ نئے حالات بھی شامل ہیں جن پر شرعی احکامات کو لاگو کرنا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اسلامی افکار اور مغربی افکار کے درمیان تصادم کے نتیجے میں مغربی افکار کے اسلام میں داخل ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس افراط و تفریط میں فہم کے ضعیف ہونے اور اجتہاد نہ ہونے کی صورت میں حالات کے شرعی احکامات سے تعلق ٹوٹے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان عوامل کے تسلسل کے نتیجے میں اسلام اور حالات کے درمیان شکوک اور جدائی پیدا ہوتی ہے، اسی لیے مسلسل تجدید کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم تجدید کے معنی اور اس کی حقیقت کے بارے میں بحث شروع کریں، پہلے ہم عصر حاضر میں بعض مسلم مفکرین کے ہاں دین کی تجدید کی سوچ کے جنم لینے کی وجوہات پر تحقیق کریں گے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مطابق اس سوچ کے پیدا ہونے کا کوئی اسلامی محرک نہیں بلکہ اس کی بنیاد ہی مغرب کی تقلید ہے؛ کیونکہ انیسویں صدی کی ابتداء سے ہی مسلمان یورپ کی سرمایہ دارانہ اقوام کے دلدادہ ہونے لگے تھے اور ہر چیز میں ان کی تقلید کرنے لگے تھے۔ اس میں سے ایک امر دین کی تجدید اور اصلاح تھا۔ اس لیے ہمیں یورپی انقلاب سے پہلے کے نصرانی یورپ میں اصلاح اور تجدید کی سوچ کے پنپنے کی تاریخ پر نظر دوڑانی ہوگی تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اپنے دین کے معاملات کے حوالے سے وہ کیا عوامل تھے جنھوں نے ان کو یہاں تک پہنچادیا، جس میں ہمارے لیے سبق موجود ہے!

یورپ میں اصلاح اور تجدید کی سوچ کی نشو نما

سولویں صدی عیسوی سے قبل یورپ کتھولک کلیسا کے ظلم وستم تلے سسکیاں لے رہا تھا۔اس نے یورپ میں اصلاحی تحریکوں اور انقلاب کو جنم دیا، پروٹیسٹنٹ سے لبرل تک اور پھر شہنشاہوں اور بادشاہوں کے خلاف حقیقی انقلاب جیسے فرانس کا انقلاب جو یورپ میں سوچ اور نظام حکمرانی کو تبدیل کرنے پر منتج ہوا۔

جرمن پادری مارٹن لوتھر نے کتھولک کلیسا کے دین کی تفسیر کے اختیار، معصوم عن الخطاء (غلطی سے پاک ہونے) اور مراعات، جو روم میں وٹیکن کے پادری تک محدود تھے، ان افکار کی اصلاح کے نام سے سولویں صدی کے اوائل میں دینی اصلاح کا نعرہ لگایا۔ لوتھر نے عہدِ جدید کی کتاب، یعنی انجیل اور عہد قدیم کی کتاب یعنی تورات کی جدید نقطہ نظر کے مطابق تجدید کی ضرورت کا نعرہ لگایا۔ یہ یورپ میں نصرانیت کی دینی تجدید کی سوچ کی ابتدا تھی۔ پھر اسی کی دعوت سے پروٹیسٹنٹ مسلک وجود میں آیا۔ نتیجتاً نصرانیت تین فرقوں میں بٹ گئی: مشرقی آرتھوڈاکس، مغربی کتھولک پاپائیت اور پروٹسٹینٹ۔ پھر اس جدید پروٹیسٹنٹ مسلک سے بے شمار نصرانی کلیسا وجود میں آئے، ہر ایک کا اپنا عقیدہ، اپنی شریعت اور اپنا مستقل دینی منہج تھا، یوں مغربی نصرانی کلیسا متعدد گروہوں اور کلیساوں میں تقسیم ہو کر آپس میں مدِ مقابل ہو گئے، جس کی وجہ لوتھر کی دینی اصلاح کی سوچ تھی۔

پھر پروٹیسٹنٹ کلیسا نے یورپ میں اٹھنے والی اس نئی لبرل سوچ کو قبول کر لیا جس نے اس تنازعے اور تصادم سے جنم لیا جس میں ایک طرف مذھبی پیشوا، بادشاہ اور حکمران تھے اور دوسری طرف مفکرین اور فلسفی تھے، جب انہوں نے الٰہی حق کے خلاف بغاوت کی اور اس کو طبعی حق کی فکر سے تبدیل کیا اور دین کو زندگی سے جدا کرنے، یعنی سیکولرازم کو ضروری قرار دیا۔ جس نے سب سے پہلے دین کو ریاست سے الگ کرنے کی اس فکر کو قبول کیا وہ برطانیہ کا پروٹسٹینٹ کلیسا تھا، جس نے 1680ء میں کرومول کے انقلاب کے بعد اسے قبول کر لیا۔ یوں نئی سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی اور سیکولرازم کی بنیاد برطانیہ میں رکھ دی گئی۔

یورپ میں ترقی کی سوچ کی بدعت

یورپ کے دین سے دستبردار ہونے اور اس کو زندگی سے الگ کرنے کے بعد اس کو دین سے الگ آئین اور قوانین کی ضرورت تھی، اس لیے یورپیوں نے کلیسا کے قوانین کے متبادل کے طور پر یونان اور روم سے نام نہاد فطری قوانین اخذ کیے۔ فطری قوانین کی حقیقت یہ تھی کہ وہ جامد تھے اور تبدیل نہیں ہو سکتے تھے، لیکن وہ قوانین جو انھوں نے بنائے، وہ ان کو مسلسل تبدیل کرنے پر مجبور رہتے تاکہ وہ حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں۔

اس امر نے ان کے لیے مشکلات پیدا کر دیں، کیونکہ جمہوریت کے انسانی قوانین انسان کی خواہشات اور مفادات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور یہ مستقل فطری قوانین کے برعکس تھا۔ اس لیے اس بات کا جواز پیدا کرنے کی ضرورت تھی کہ فطرت خود ایسے قوانین پر مشتمل ہے جو ترقی کرتے ہیں؛ اسی لیے ایک ایسی خیالی فکر ایجاد کی گئی جس کو ارتقاء کا نام دیا گیا اور اس کو فطرت کا ایک قانون قرار دیا گیا۔ یوں ارتقاء کا نظریہ رکھنے والوں نے یہ گمان کیا کہ نظام اور انسانی قوانین کے لیے ارتقاء لازمی ہے کیونکہ یہ اصل میں فطرت کا ہی قانون ہے، یہی دائمی تغیر اور ارتقاء ہے۔ اس لیے جو قوانین وہ وضع کرتے تھے ان کا نئے حالات اور واقعات کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری تھا۔ ان کا دعوی تھا کہ جو نظام زمانے کے گزرنے کے ساتھ ترقی نہیں کرتے، ان کے سامنے بالآخر مسائل کے انبار لگ جائیں گے جن کی بدولت وہ حالات و واقعات کے ساتھ چلنے سے عاجز ہونگے اور یوں وہ نظام فرسودہ اور ناکارہ ہو جائیں گے۔ اسی لیے مسلسل ایسے قوانین کی ضرورت ہے جو زمانے کے ساتھ تبدیل ہوں اور ترقی کریں!!

چونکہ مغرب کے نزدیک تجرباتی علم ہی درست اور صحیح ہونے کی اساس ہے، چنانچہ یورپیوں نے ارتقاء کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے علمِ حیات سے فائدہ اٹھایا کہ یہی زندہ کائنات کی زندگی میں طبعی قانون ہے۔ یوں فرانسن میں جارج دی بوفوں کے ہاتھوں طبعی ارتقاء کا مکتبہ فکر وجود میں آیا۔ اس کے بعد برطانیہ میں ڈارون نے اپنے نظریئے میں طبعی صورت حال کے مکتبہ فکر کے افکار اور طبعی ارتقاء کے مکتبہ فکر کے افکار کو گڈمڈ کرنے کے بعد نظریہ ارتقاء (نشو نما اور ارتقاء) کا اختراع کیا۔

یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت کو وضع کرنے والے ڈارون کے نظریئے کی بنیاد پر یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ارتقاء و ترقی اور تجدید فطری قوانین میں سے ہیں اور ناگزیر ہیں، یہی نظاموں اور افکار کو زندہ رکھتے ہیں جس سے وہ نشو نما پاتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں، جو ترقی نہیں کرتا وہ سکڑ جائے گا اور بلا آخر فناء ہو جائے گا۔ یہ دعوی ہی ان کے نظاموں اور قوانین کی ناکامی کا اعتراف ہے مگر اس کے لیے لگے لپٹے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے، یعنی اگر قانون اور نظام ان مسائل اور حالات کا حل دینے کی اہلیت اور استطاعت نہیں رکھتے جن کے لیے ان کو وضع کیا گیا ہو تو وہ قانون اور نظام ناکام اور فاسد ہیں۔ ان کو وضع کرنے والوں کی جانب سے ترقی اور جدت کے نام پر ان قوانین کو تبدیل کرنا دراصل ان قوانین اور نظام کے فاسد اور ناکام ہونے کو ترقی اور جدت کے نعروں میں چھپانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اگر وہ گہرائی سے سوچتے تو اس نتیجے پر پہنچتے کہ کسی بھی نظام یا قانون کی درستگی اور کامیابی کا معیار اس کے ان اصولوں اور اساس کی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے جس بنیاد پر وہ نظام کھڑا ہوتا ہے۔ اگر وقت کے ساتھ نئے مسائل اور حالات وقوع پزیر ہوں اور یہ نظام اور قانون اپنے ان قواعد اور اساس سے ہٹے بغیر ان کا حل دے، تب یہ مؤثر اور کامیاب سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر قانون بنانے والے نئے پیدا ہونے والے حالات سے موافقت پیدا کرنے کیلئے زبردستی اس نظام کو تبدیل کرنے اور اس کو شکل دینے میں قانون کی فاسد تاویلات کرنے پر اتر آئیں تو وہ اس کی اساس اور قواعد سے ہٹ جائیں گے، اس کے مقاصد اور پیمانوں سے انحراف کریں گے، جو اس قانون کے فاسد ہونے اور نئے پیدا ہونے والے مسائل کے حل میں اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نظام اور قوانین میں ارتقاء اور تجدید کا دعوی نظام اور قوانین کے خرابی اور ناکامی کے نتائج سے منہ چھپانے کی کوشش ہے۔ نظام اور قوانین کی صلاحیت کا معیار مسائل کا کامیاب حل دینے کی قدرت ہے، یہ ترقی کے جھوٹے عنوان کے تحت رنگ بدلنے، توڑنے مروڑنے اور پیوند کاری کی صلاحیت نہیں۔

مسلمانوں کے ہاں اصلاح اور "تجدید" کے رجحان کی نشو نما

فرانس نے 1798ء میں نپولن کی قیادت میں مصر پر اور اس کے بعد فلسطین پر حملہ کر دیا۔ پھر 1801ء میں فرانس کے وہاں سے نکلنے پر محمد علی پاشا مصر کے حکمران بن گئے۔ اس نے مصر سے کچھ چنیدہ نوجوانوں کو سائنسی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجا۔ وہ جب واپس آئے تو ان میں سے کئی نوجوان نئے یورپی افکار جیسے جمہوریت، آزادیاں اور سرمایہ دارانہ نظام کے رنگ میں رنگ چکے تھے، کیونکہ وہ یورپ کی صنعتی اور تہذیبی ترقی سے متاثر ہو گئے تھے۔ انہوں نے مصر اور اس کے قرب وجوار میں ان نئے افکار کی نشر واشاعت شروع کر دی۔ اس گروہ کے نمایاں لوگوں میں سے رفاعہ الطھطاوی، عبدالرحمن الکواکبی اور خیر الدین التونسی وغیرہ تھے۔

تہذیب اور نظام میں یورپ کی تقلید کی دعوت دینے والے اس نئے گروہ کے نتیجے میں ایک اور گروہ بھی وجود میں آگیا جو اسلام اور مغربی تہذیب کی ہم آہنگی کا داعی تھا اور یہ اصلاحی مکتبہ فکر کی تحریک تھی۔ اس گروہ کا سربراہ جمال الدین افغانی تھا جس نے مسلمانوں میں تجدید اور اصلاح کے افکار کی ترویج کرنی شروع کر دی۔ جامعہ الازہر کے علماء کا ایک گروہ جمال الدین افغانی سے متاثر ہوا، ان علماء میں نمایاں محمد عبدہ تھے جو بعد میں الازہر کے شیخ بن گئے، ان کے شاگردوں میں المنار میگزین والے محمد رشید رضا تھے۔ پھر یہ مرکزی اصلاحی گروہ جو سرمایہ درانہ آئیڈیولوجی کی تہذیب اور اسلامی آئیڈیولوجی کی تہذیب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ تحریکوں، جماعتوں اور افراد کی شکل میں مسلمانوں کے مختلف علاقوں پھیل گیا۔

مسلمانوں کے ہاں اس اصلاحی مکتبہ فکر کی نمایاں دعوت تجدید اور دینی اصلاح کی فکر ہے۔ جب ہم اس فکر کو باریک بینی سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے نصاری نے جو دینی اصلاح کی فکر کا نعرہ لگایا تھا، یہ فکر اسی سے مشابہت رکھتی ہے، جس کے نتائج میں سے نمایاں ترین چیز لبرلزم اور دین کی زندگی سے جدائی کو قبول کرنا تھا۔ اس اصلاحی مکتبہ فکر نے حکمرانی میں مغرب کی جمہوریت اور اس کے سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کو قبول کر لیا مگر اس کو تجدید اور موافقت کے پردے میں شرعی غلاف پہنا دیا، مگر اس اصلاحی مکتبہ فکر نے اعلانیہ طور پر لبرلزم کی فکر کی حمایت

نہیں کی جیسا کہ یورپ کے پروٹیسٹنٹ نے کیا، بلکہ انھوں نے اسلامی عقائد، عبادات اور اخلاقیات پر قائم رہتے ہوئے مغرب کے اقتصادی اور حکمرانی کے نظام سے استفادہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔

اصلاح پسندوں نے اسلامی شریعت کے ایسے امور میں چھان بین کے ذریعے دین کی تجدید کی کوشش کی جو مغرب کے نظاموں اور افکار میں سے اخذ کرنے کو جائز قرار دیتے ہوں۔ چنانچہ ان کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث مل گئیں جو تجدید کی بات کرتی ہیں۔ یہ اور اس جیسا دیگر مواد ان کے لیے اصلاح اور تجدید کے پردے میں مغرب سے ہم آہنگی کے لیے دینی امور میں تبدیلی کا دروازہ ثابت ہوا۔ پھر یہ لوگ اصولِ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اس کو دیکھا کہ وہ ان کے لیے دروازہ بند کرتا ہے اور ان کے مغربی نظاموں کو قبول کرنے کے لیے رکاوٹ ہے، مگر وہ تلاش اور تحقیق کرتے رہے یہاں تک کہ ان کو ایک سراخ مل گیا جس کے ذریعے وہ داخل ہوئے اور یہ سراخ مقاصد شرعیہ اور مصالح مرسلہ کی ایسی تاویل کرنے کی سوچ ہے جس کے ذریعے اقتصاد اور نظامِ حکمرانی سے متعلق مغربی امور کو "وسیع تر مفاد" کے لیے قبول کیا جاسکے، یہ فرض کرتے ہوئے کہ مغربی تہذیب ہی تہذیب یافتہ، ترقی یافتہ اور حکمت پر مبنی ہونے کا معیار ہے، اور اسلام کے احکامات کی اس کے ساتھ موافقت اور ہم آہنگی ضروری ہے۔

دین کی تجدید کی سوچ کے پروان چڑھنے کی یہ مختصر تاریخ ہے۔ مسیحی مغرب میں جو کچھ ہوا، یہ اس کے تجربے سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش اور اسی کی مشابہت ہے؛ مگر یہ امر گوہ کے اس بل میں داخل ہونا ہے جس میں یورپ کے عیسائی داخل ہوئے اور اس کے نتیجے میں ان کے ہاں دین اور دنیا کی جدائی، خدا کے وجود کا انکار، دیگر منحرف عقائد اور نئے مذہبی فرقے وجود میں آئے جن میں کچھ بھی مشترک نہیں۔ کیا ہم مسلمان عیسائیت کے دین کو تباہ کرنے کے اس تجربے کی نقل کرنے کو قبول کرکے اس کو اسلام پر لاگو کرسکتے ہیں؟ پھر یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ یہ دین کی تجدید ہے؟!

افکار کی اعصاب شکن جنگ کے دوران تجدید

موجودہ صدی کی ابتداء میں امریکہ نے سرمایہ دارانہ مغربی تہذیب کے قائد کی حیثیت سے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لبادے میں اسلام کے خلاف جنگ شروع کی۔ امریکہ کے سابقہ وزیر دفاع ڈانلڈر مسفیلڈ نے 2003ء میں افکار کے خلاف جنگ کے لیے نئی ایجنسی تشکیل دینے کا مطالبہ کیا۔ یہ دوبارہ شروع کی گئی پرانی جنگ ہے تاکہ اکیسویں صدی کے چیلنجوں کے خلاف مزید افادیت سے نمٹا جاسکے۔ اسی طرح امریکی دانشور تھامس فریڈمین نے افکار کی جنگ کے بارے میں مضامین کا ایک مجموعہ لکھا، جس میں انہوں نے لکھا کہ جنگ مسلم معاشروں کے اندر ہونا ضروری ہے، یہ اعتدال پسندوں کو مضبوط کرنے سے ہوگا تاکہ وہ مغرب کی نیابت کرتے ہوئے انتہا پسندی، تشدد اور دہشت گردی کے افکار سے جان چھڑانے کے لیے اس مہم کو چلائیں۔

چونکہ امت میں اسلام کی طرف رجحان طاقتور ہوتا جارہا ہے اور اس کو ختم کرنا ناممکن نظر آرہا ہے، چنانچہ سرمایہ دار مغرب نے یہ محسوس کیا کہ بیدار اور مخلص مسلمان کوشش کررہے ہیں کہ آج دوبارہ خلافت کے قیام کی دعوت کو مضبوط کیا جائے، اور کس طرح امت میں یہ بڑھتا ہوا رجحان مغرب کیلئے خطرہ ہے، خصوصاً جب تہذیبوں کے تصادم میں مغرب زوال کی جانب گامزن ہے اور اسلام آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح مغرب نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے علاقوں میں موجودہ حکومتیں بے کار ہوچکی ہیں، ان کی عوام اور ان کے حکمرانوں کے درمیان اعتماد ختم ہوچکا ہے۔ اسی لیے مغرب سمجھتا ہے کہ اسلام کے اقتدار تک پہنچنے سے پہلے ہی معاملے کو سنبھال لے، اسی لیے اس نے اسلام سے نمٹنے میں تیزی دکھائی۔ مغرب چاہتا ہے کہ تجدید اس کی مرضی کے مطابق دین کو پگھلا کر اس کو تبدیل کرنے اور اس کی نصوص کے فہم سے کھلواڑ کرکے اس کی مرضی کے طریقے پر ہو۔ مغرب اسلام سے ان مضامین کو نکالنا چاہتا ہے جن کے خلاف وہ لڑ رہا ہے اور جو مغربی تہذیب کو چیلنج کرتے ہیں، خصوصاً سیاست، معیشت اور حکمرانی سے متعلق موضوعات۔

حالیہ دور میں اس کی جدوجہد سیاسی اسلام کے خلاف جنگ پر مرکوز رہی اور اس بات کی دعوت پر کہ اسلام صرف اخلاقیات، عبادات اور شعائر کی دعوت دیتا ہے، اس میں کوئی ریاست کوئی شریعت کوئی سیاست اور کوئی جہاد

نہیں۔ یہ دعوت شرعی مفہوم کے مطابق دین کی تجدید کی دعوت کے مخالف ہے۔ وہ نمونہ جس کو کافر مغرب نے مسلمانوں کو خلافت کے قیام اور اللہ کے نازل کردہ کے ذریعے حکومت کرنے سے دور کرنے کے لیے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب نے اسلامی تحریکوں پر اسلامی سیاست سے دستبردار ہونے کے لیے سخت دباؤ ڈالا ہوا ہے، ان کو ختم کرنے کی دھمکی دیتا ہے، اور اسلام میں سیاست کی عدم موجودگی کا جھوٹ بول کر ان کو صرف خیراتی اور اخلاقی کاموں اور عبادات کی اجازت دیتا ہے۔

اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے استعماری کافر کی پالیسی یہ ہے کہ ایسے آلہ کار تیار کیے جائیں جو اس کی پالیسی سے مطابقت رکھیں، دین کی تجدید کے نام پر اسلام کے نئے قواعد اور اصول بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس من گھڑت تجدیدی تجاویز میں اصول دین کی تجدید، نئے فقہ کی ضرورت، حقیقت پسندی یا فقہ الواقع (حقیقت پسندی کا فقہ)، فقہِ ضرورت (ضرورت کا فقہ)، فقہ الموازنات (توازن کا فقہ)، دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی اور اسلام میں لچک شامل ہیں، تجدیدِ دین کا دعوی کر کے فقہ کے درست اصول کے نظم وضبط کے بغیر ٹیڑھے انداز سے مقاصدِ شرعیہ سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اسی طرح موجودہ دور کے دینی نصوص کو پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

بدعت اور تجدید

موجودہ زمانے میں مغربی مفاہیم کے غلبے کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاں دو شرعی مفاہیم کے درمیان الجھن نظر آنے لگی: تجدید کا تصور اور بدعت کا تصور۔ اسلام میں تحقیق کے موضوع میں ان دونوں تصورات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اس لیے ان میں الجھن درست نہیں۔ اسلام نے تجدید کی تصدیق کی ہے اور اس کی دعوت دی ہے، جبکہ دوسری طرف اسلام نے بدعت سے منع کیا ہے اور اس کو گمراہی قرار دیا ہے۔ ان دونوں تصورات کے درمیان فرق دلائل کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے **«إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدِّد لها دينها»** **"اللہ اس امت کے لیے ہر سو سال کے شروع میں ایک شخص**

بھیجتا ہے جو اس امت کے لیے اس کے دین کی تجدید کرتا ہے"۔اس باب سے متعلق دوسرے دلائل سے اجتناب کرنا درست نہیں جیسے رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے **«وإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة، وكل ضلالة في النار» "ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے"**۔ اسی طرح آپ ﷺ کے اس قول سے: **«من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد» "جو ہمارے اس دین میں ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں سے نہیں تو وہ بات مسترد ہے"**۔

بدعت کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں: جو کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو شریعت میں ثابت نہیں اور اس کو دین میں شامل کرے تو اس نے بدعت کی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے: **«من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد» "جو ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں سے نہیں تو وہ بات مردود ہے"**۔اسی طرح جس نے اس چیز کا انکار کیا جو شریعت سے ثابت ہو اس نے بھی بدعت کا ارتکاب کیا جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: **﴿أَفَتُؤۡمِنُونَ بِبَعۡضِ ٱلۡكِتَٰبِ وَتَكۡفُرُونَ بِبَعۡضٖ﴾ "کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو"**(البقرۃ:85)۔چنانچہ بدعت کوئی نئی چیز پیدا کر کے دین میں ایسی چیز کا اضافہ کرنا ہے جو دین میں سے نہیں۔یوں بدعت کا مفہوم دین میں کسی چیز کا اضافہ یا کمی کرنا ہے، زیادہ تر یہ اضافہ ہی ہوتا ہے، وہ بھی ایسے معاملات میں جن کی شرعی کیفیت مقرر ہیں- یہ عبادات جیسے نماز اور حج کے ساتھ خاص بھی ہو سکتا ہے۔چنانچہ مغرب کی نماز کی تین رکعتیں ہیں، لہٰذا جو اس میں اضافہ کر کے اس کو چار یا پانچ کرے تو یہ بدعت ہے اور یہ کام حرام ہے۔اسی طرح کرونا وائرس کا بہانہ بنا کر نماز میں فاصلہ بدعت اور حرام ہے کیونکہ یہ صفیں سیدھی رکھنے اور مل کر کھڑے ہونے کی شرعی کیفیت کو تبدیل کرنا ہے۔اسی طرح روح کو تقویت پہنچانے کے نام پر جسم کو تکلیف دینا اور اس کو حلال نعمتوں سے فائدہ اٹھانے سے روکنا بدعت ہے اور ہندو فلسفے سے ماخوذ ہے۔

اصولِ فقہ میں نئے دلائل لانے کی کوشش بھی بدعت ہے جیسے درء المفاسد(فساد کو دور کرنے)اور جلب المصالح(مفاد کو حاصل کرنے) کے نام سے سرمایہ دارانہ فائدے اور نقصان کو داخل کرنا۔جو بھی مغرب

کے جدید کفریہ نظام کو مقاصدِ شرعیہ کے نام پر اسلام میں داخل کر کے لوگوں کو ان کے دین کے بارے میں شش و پنج میں ڈالنا چاہتے ہیں وہ بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بدعت دین میں اس چیز کا اضافہ تھا جو دین میں سے نہیں، جبکہ موجودہ زمانے میں دین میں کمی کر کے، خاص طور پر سیاسی اور معاشی نظام کو نکال کر بدعت کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

جہاں تک تجدید کا تعلق ہے، تو یہ ایک حقیقی امر ہے جس کی ضرورت پڑتی ہے، جو ہر صدی میں واقع ہوتا ہے اور جس سے دین تمام ملاوٹوں سے پاک ہو جاتا ہے جب اس میں سے لاتعلق چیزیں نکال دی جاتی ہیں اور پہلے کی نکال دی گئی چیزیں واپس کر دی جاتی ہیں، یوں مجدد اسی طرح دین کو واپس لوٹاتا ہے جس طرح وہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ تجدید سے ہر گز مراد دین میں کسی ایسی نئی چیز کا اضافہ نہیں جو اس میں سے نہیں، کیونکہ دین میں کوئی ایسی جدید چیز لانا جو اسلام میں سے نہیں یہ دین میں بدعت اور قابل مذمت ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تجدید سے مراد مردہ کو زندہ کرنا، جو منہدم ہو گیا ہے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا اور جو اضافہ ہو گیا ہے اس کو زائل کرنا ہے، یعنی اسلامی فکر کی صفائی کرنا اور اس کو چمکانا ہے، اس کو اس طرح صاف شفاف بنانا ہے کہ وہ اس قابل بن جائے کہ اس کے ذریعے دوبارہ نشاۃ ثانیہ حاصل ہو جائے۔

تجدید کے اہم ترین امور میں سے ایک معاملہ ان نئی حرام بدعات کا تعین ہے جن کو مختلف اسلامی ادوار میں ایجاد کیا گیا اور ان کو زائل کرنا کیونکہ یہ بدعتیں ہیں جن کی دین میں کوئی جگہ نہیں مگر ان کو دین سے جوڑ دیا گیا۔ ہاں اگر نئی چیزیں ایسی نہ ہوں جن پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان لاگو ہوتا ہو: **«من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد»** **"جو ہمارے اس دین میں ایسی کوئی نئی بات لائے جو اس میں سے نہیں تو وہ بات مردود ہے"**، اور وہ بات اصلاً اسلام سے ہی ہو اور مفہوم مخالف کے مطابق مردود نہیں بلکہ اسلامی ہونے کی وجہ سے مقبول ہو، تو وہ بدعت محرمہ نہیں بلکہ ایک اچھی نئی بات ہے جس کو مجازاً "بدعت حسنہ" قرار دے کر قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی نئی

باتیں جو اسلام کا حصہ ہیں تجدید کے باب میں شامل ہیں۔ یہ مستحسن تجدید ہے اور اسلام میں سنن حسنہ کے ضمن میں آتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی وجہ سے اسلام میں سنن حسنہ کا مفہوم تجدید سے مطابقت رکھتا ہے: **«من سنَّ في الإسلام سنَّة حسنة كان له أجرها وأجر من عمل بها من بعده لا ينقص ذلك من أجورهم ...» "جو اسلام میں کوئی سنت حسنہ (اچھا طریقہ) شروع کرے تو اس کا اجر اس کو ملے گا اور جو بھی اس کے بعد اس پر عمل کرے گا اس کا اجر بھی اس کو ملے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہو گی"**، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ سنن سے مقصود وہ قابل تعریف اعمال ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے، اگرچہ نبی ﷺ کے دور میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کی نماز کو جماعت سے پڑھنے کا قول اس کی ایک مثال ہے کہ: (نعمت البدعة هذه) "یہ اچھی بدعت ہے"۔ کسی عمل کا حسن یا قبیح ہونا صرف شریعت سے ہی سمجھا جاتا ہے جہاں سے اس عمل کے ثبوت کیلئے دلیل مہیا ہو سکتی ہے ورنہ وہ مذموم بدعت ہو گی۔

اسلام میں تجدید اور سنن حسنہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ جو کسی سنت حسنہ کی ابتدا کرتا ہے وہ شرعی طور پر مطلوب ایک ایسے عمل کو انجام دیتا ہے جس کے لیے شریعت نے کوئی خاص کیفیت اور خاص ہیئت مقرر نہیں کی۔ وہ شخص یہ عمل ایسے متعین طریقے سے انجام دیتا ہے جو لوگوں کو اس عملِ خیر میں اس کی اقتداء پر ابھارتا ہے۔ جبکہ تجدید میں سنن حسنہ بھی داخل ہیں اور اس کے علاوہ معاملات بھی جیسے مردہ سنتوں کا احیاء، بدعتوں کا ازالہ اور اس کے علاوہ ان مسائل کو حل کرنا جو جدید دور کے ابھرتے معاملات کے نتیجے میں پیدا ہو چکے ہوں۔

جس تجدید کی مسلمانوں کو دائمی ضرورت رہتی ہے وہ ان اہم مسائل کا حل ہے جو اس زمانے میں امتِ مسلمہ کے لیے اہمیت کے حامل ہوں اور مسلمانوں کو ان مسائل کے بہترین تجدیدی حل کی ضرورت ہو۔ اس کی ایک مثال خراج کا وہ تصور ہے جس پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ آپ ؓ سمجھ گئے کہ ریاست، افواج کے مفادات پر خرچ کرنے اور فقراء کو کھلانے وغیرہ کے لیے بیت المال کیلئے اضافی اور دائمی ذریعہ آمدن کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اس

کی مثالوں میں سے ایک اور مثال امام شافعی کی جانب سے ایسے وقت میں علمِ اصولِ فقہ کے قواعد وضع کرنا ہے جب امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے باہمی فقہی اختلافات کے بڑھنے سے بہت سے سوالات نے جنم لیا جنہیں لازماً اسلامی فقہ کے اصول اور قواعد وضع کرکے حل کرنے کی ضرورت تھی۔ تجدید کی مثالوں میں سے "وقف" کا تصور بھی ہے جس کو مسلمانوں نے مسلم معاشرے کی اجتماعی ضروریات کو پوری کرنے اور ان کفائی فرائض کو ادا کرنے کے لیے ایجاد کیا جن کی ادائیگی کا ان کو حکم دیا گیا تھا، جس میں مالدار لوگ کچھ جائیدادیں اور زمینیں یا اموال عام مسلمانوں کے فائدے کے لیے صدقہ جاریہ کردیتے ہیں، (الوعی میگزین شمارہ 407/اگست 2020 سے "تجدید کی فقہ" کا موضوع)۔

بدعت اور تجدید میں فرق کو واضح کرنے کیلئے ضروری ہے کہ تجدید کی فکر کا شریعت میں سے ہی کوئی ماخذ ہونا چاہیے۔ لہٰذا سیدنا عمرؓ نے خراج کے حوالے قرآن کی اس آیت کو دلیل کے طور پر پیش کیا: ﴿**وَٱلَّذِينَ جَآءُو مِنۢ بَعۡدِهِمۡ**﴾ **"اور جو لوگ ان کے بعد آئیں گے"** (سورۃ الحشر: 10)، یعنی وہ مسلمان جو فاتحین کے بعد آئیں گے، ان کیلئے مالِ فئے میں حصہ ہوگا یعنی خراجی زمین کی ملکیت میں، اور صحابہؓ نے آپؓ کی اس رائے کو قبول کیا۔ اسی طرح خیراتی اوقاف کی اصل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے: **«إذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاث: صدقة جارية ...»** **"جب کوئی بنی آدم مرتا ہے تو سوائے تین چیزوں کے اس کا ہر عمل منقطع ہو جاتا ہے: صدقہ جاریہ۔۔۔"**، لہٰذا اوقاف صدقہ جاریہ کے باب میں داخل ہے۔ اصولِ فقہ کے علم کی جڑیں بھی قرآن، سنتِ نبوی ﷺ، آثار صحابہ و فقہاء میں موجود ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے ان قواعد اور اصول کو جمع کرکے مرتب کیا، ان کو وسعت دی اور ایک نئے علم کو وجود بخشا۔ اس لیے وہ تمام نئی باتیں جن کی شریعت میں کوئی اصل ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے مفہومِ مخالف کے ماتحت آتے ہیں: **«ما ليس منه»** **"جو اس دین میں سے نہیں"**، یعنی جو اس دین میں سے ہی ہیں، یعنی ان کی اصل اسی دین میں موجود ہے تو ایسی نئی بات مقبول ہے اور یہ مستحسن تجدیدی امر ہے۔ اس میں نئی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے مصائب، ضروریات اور مسائل کا ادراک کرکے ان کا نیا حل وحی سے متصل معتبر اصولوں کی بنیاد پر شریعت سے نکالا جاتا ہے، ایسا حل نہیں کہ جس کا کوئی اصل نہ ہو یا وہ ظنی

اصولوں جیسے مصالح اور مقاصد شرعیہ میں موجود چور دروازوں پر اعتماد کرتا ہو، یہ اساس سے ہی غیر اسلامی چیزوں سے متاثرہ حل ہیں، اس لیے یہ شرعی تجدید کے زمرے میں ہی نہیں آتے، بلکہ یہ بدعت ہیں۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کو جن مستحسن تجدیدی امور کی پابندی کی ضرورت ہے وہ اسلامی افکار اور احکامات پر اعتماد کے متزلزل ہونے کا حل نکالنا ہے جو مغربی تہذیب کی مسلمانوں کے خلاف فکری یلغار سے پیدا ہوا، خاص طور پر سیاست، اقتصاد اور حکمرانی کے حوالے سے، اس لیے اس دور میں درپیش اس عظیم مہم کو سر کرنے کے لیے ایک مجتہد مجدد کی ضرورت ہے۔

ارتقاء کے دعوے کے ساتھ تجدید کا تعلق

بشمول مسلمانوں کے، عالمی سطح پر "ارتقاء" کی اصطلاح کے مثبت انداز میں عام ہونے کے شدید خطرے کے سبب اس اصطلاح میں موجود تلبیس اور کجی کو واضح کرنا، اس اصطلاح کو کسی دوسری مناسب اور حقیقی اصطلاح سے تبدیل کرنا اور اس خیالی اصطلاح کے استعمال سے باز آنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

ارتقاء ایک چیز کا ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں تبدیل ہونا ہے، جس کا مطلب ہے ایک چیز کی تدریجی انداز میں بہتر اور اچھی شکل کی طرف تبدیلی۔ مغرب کے نزدیک ارتقاء کا مفہوم جدت، تہذیب اور ترقی سے جڑا ہوا ہے۔ اسی لیے جدت اور تہذیب یافتہ ہونا اگرچہ ارتقاء کے معنی نہیں رکھتے مگر اس کے معنی کے قریبی الفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں، یعنی یہ ان کے نزدیک ارتقاء کے لفظ کے مترادف ہیں۔ اسی لیے دین کے ارتقاء کا مطلب دین کو اس طرح تبدیل کرنا ہے کہ وہ تہذیب اور جدت سے ہم آہنگ ہو اور ہر اس چیز کو ہٹانا جو چیز اس کو بہتر کرنے کی راہ میں روکاوٹ بنے۔

جبکہ تجدید کا معنی کسی چیز کو پھر سے نیا کرنا ہے یعنی پہلی بار اس کو بناتے وقت وہ جس صورت میں تھی اس کو اسی صورت میں واپس لانا ہے۔ کپڑے کی تجدید یہ ہے کہ اس کو درست کیا جائے اور جو اس کے ساتھ لگ گیا ہے اس کو ہٹا کر ایسا کیا جائے گویا کہ وہ دوبارہ نیا ہو جائے۔ کسی مشین کی تجدید اس کو صاف اور ٹھیک کر کے اس کو اس کام کے قابل بنانا ہے جس کام کے لیے اس کو بنایا گیا تھا، اس طرح کہ وہ بالکل نئی جیسی ہو جائے۔ یوں تجدید کسی چیز کو اس کی اصل اور ابتدائی حالت کی طرف لوٹانا ہے تاکہ وہ وہی کام کرے جس کے لیے اس کو بنایا گیا تھا۔

فکری نقطہ نظر سے ارتقاء اور تجدید میں یہ فرق ہے کہ ارتقاء میں کسی چیز کی اصل کی حفاظت اور اس کو اپنے اصل کی طرف لوٹانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایسی تبدیلی مقصود ہوتی ہے کہ اس کو تبدیل کر کے تہذیب اور جدت سے ہم آہنگ کی جائے اور ان افکار کو ہٹا دیا جائے جو اس تبدیلی اور ارتقاء شدہ جدت کی طرف پیش رفت کی راہ میں روکاوٹ ہیں، چاہے اس کے لیے اس کی اصل کو ہی کیوں نہ تبدیل کرنا پڑے۔ جبکہ تجدید کسی چیز کی اصل اور روح کی حفاظت کی خاطر اس کی اصلاح کرنا اور اس کے ساتھ چمٹی غیر متعلقہ چیزوں کو الگ کرنا ہے۔

یوں دین کے ارتقاء کا معنی اس کے افکار کو تبدیل کر کے اس کو ایسا بنانا ہے کہ وہ تہذیب اور جدت کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور جو اس کو بہتر کرنے کی راہ میں روکاوٹ ہو اس کو ہٹانا، اسی لیے اس کے ذریعے بعض ایسے افکار کو بھی دین میں داخل کیا جاتا ہے جو چاہے اس کے اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں؛ لیکن چونکہ وہ تہذیب یافتہ اور جدید ہے اس لیے اسی کے ذریعے ترقی ہو گی۔ جبکہ تجدید کے معنی دین کو بہتر طریقے سے سمجھنا اور اس کو دوبارہ اسی حالت میں واپس کرنا ہے جیسے وحی میں اس کو اتارا گیا تھا، شرعی نصوص کی حقیقت کو درست شکل میں سمجھنا اور اس میں سے ان امور کو ہٹانا جو اس میں سے نہیں اور اس کی سمجھ کو ضعیف کرتے ہیں۔ یہ فکر کو شفاف کرنے، چمکانے اور دین میں کی گئی تحریف کو چھپانے اور اس دین کو بدصورت دکھانے کے عوامل سے پاک کرنا ہے۔

بعض لوگوں کی جانب سے ارتقاء کی اصطلاح سے مراد کمال اور بہتر بنانا لیا جاتا ہے، یعنی اشیاء اور معاملات کو سمجھنے میں بہتری اور صنعتوں میں مہارت کو بہتر بنانا؛ مگر یہ معنی ہی کمال کے مفہوم کو ارتقاء کے مفہوم کے ساتھ خلط ملط کرنا ہے؛ کیونکہ کمال پرانی چیز میں بھی ہو سکتا ہے اور جدید چیز میں بھی لیکن ارتقاء صرف پرانی سے نئی چیز ہی کی طرف ہو سکتا ہے کیونکہ ارتقاء ایک حالت سے بہتر حالت کی جانب تبدیلی ہے۔

لہٰذا مغرب میں ارتقاء کے نظریئے کے تحت یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ہر نئی چیز ارتقاء شدہ (ترقی یافتہ) ہے اور یہ پرانی سے بہتر ہے۔ ارتقاء کی یہ فکر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ تاریخ میں کبھی زوال کا دور نہیں آیا، جبکہ حقیقت اور تاریخ کے حقائق ہمیں بتاتے ہیں کہ کمال اور بہتری قدیم اشیاء میں بھی ہو سکتی ہے اور جدید میں بھی، کمال کا زمانہ قدیم سے کوئی تعلق ہے نہ ہی زمانہ جدید سے، بلکہ کمال کا تعلق امور کے فہم اور ادائیگی کی کیفیت سے ہے۔ چنانچہ اصولِ لغت، اصولِ دین اور فقہ کے علوم قدیم علوم ہیں اور آج ایسے کوئی علماء نہیں جو ان قدیم علماء کی برابری کر سکیں یا ان کے قریب بھی ہوں، جنہوں نے ان علوم میں مہارت حاصل کی اور ان کا فہم حاصل کرنے اور ان کی تالیفات میں کمال حاصل کیا۔

رہی بات ارتقاء کے مسئلے کو جدید صنعتوں کے ساتھ خلط ملط کرنے کی، تو ان میں ترقی یورپ میں نئی آئیڈیالوجی کے نتیجے میں ہوئی جس کے نتیجے میں ہر میدان میں ترقی ہوئی جن میں صنعتی سائنس وغیرہ شامل تھیں، مگر اس کا زمانے یا ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے ادوار میں مسلمان بھی سائنس میں بہت آگے اور ترقی یافتہ تھے مگر مسلمان فکری انحطاط کی وجہ سے پسپا ہوئے اور پیچھے رہ گئے۔

اس لیے "ارتقاء" کی اصطلاح کو چھوڑ کر اس سے بہتر، اس سے گہری اور درست اصطلاح "کمال" (احسان) کو اپنانا ضروری ہے۔

تجدید یا ارتقاء کب ناگزیر ہو جاتا ہے؟

جب کسی معاشرے میں مسائل کے انبار لگنے لگتے ہیں اور نظام و قوانین ان کو حل کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں ،جب اوپر تلے مسائل کے ڈھیر لگتے ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو، تو لوگ ان اسباب کو تلاش کرتے ہیں جو ان مسائل کو پیچیدہ کرتے ہیں۔ تب ان کو ان نظاموں اور قوانین کی تجدید یا ترقی میں راستہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کے افکار اور مفاہیم کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔

یہ بات اس وقت درست ہوتی ہے جب یہ نظام، قوانین اور مفاہیم کسی ایسے قطعی درست فکری قاعدے سے نہ پھوٹتے ہوں بلکہ انسانوں کی جانب سے خود ساختہ قوانین، نظام اور مفاہیم ہوں، تب انسانوں کے مسائل کے حل اور ایسے مفاہیم کی تلاش کے لیے جو تہذیب، جدت اور ترقی سے ہم آہنگ ہوں، اس فکر اور ان قوانین میں ترقی اور جدت کا جواز بنتا ہے۔ لیکن اگر یہ فکر اور قوانین ایک ایسے قطعی صحیح فکری قاعدے پھوٹتے ہوں جو انسان کے خالق کی جانب سے ایک ربانی دین ہو، تب اس کی ترقی اور تبدیلی کی نہیں بلکہ صرف تجدید کی ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ اسلام اللہ کا وہ دین ہے جس میں باطل کسی بھی جانب سے داخل نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ انسان کے خالق کی طرف سے ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ان انسانوں کے لیے کون سے افکار، نظام اور قوانین بہترین ہیں۔ اس لیے انسان کے لیے اس دین کے اصولوں اور بنیاد کو چھیڑنا جائز نہیں نہ ہی ان احکامِ شرعیہ کو جو اس میں آئے ہیں کیونکہ یہ سب ربانی وحی کا ہی حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں ترقی اور جدت کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ دین ربانی اس تمام حکمت والے، ہر چیز کا علم رکھنے والے کی طرف سے ہے۔

ہمارا دینِ اسلام کو ترقی کی ضرورت نہ ہونے پر اصرار اس لیے بھی ہے کیونکہ جو لوگ مغربی سرمایہ دارانہ تہذیب کے افکار کو جدت اور ترقی کے نام پر اسلام میں داخل کرنا چاہتے ہیں، یہ درحقیقت اس غالب تہذیب کی اندھی تقلید ہے، حالانکہ یہ سرمایہ دارانہ تہذیب اور اس کی آئیڈیالوجی انسان ہی کی بنائی ہوئی ہے جو یقیناً ہر قسم کی غلطیوں، خلل، نقص اور تقصیر کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کی بنیاد اور فکری قاعدہ ہی غلط ہے، عملی نفاذ میں اس

کی ناکامی اس کے علاوہ ہے، اس نے دنیا کو ہولناک نتائج سے دوچار کیا، غیر یورپی اقوام اور عوام کے حوالے سے جرائم کا ارتکاب کیا۔

رہی یہ بات کہ اس کے باوجود دین کی تجدید کیوں ضروری ہے جبکہ یہ ربانی دین ہے اور تبدیل نہیں ہوتا یا ترقی نہیں کرتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تجدید کا کتاب وسنت کے دینی نصوص کی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں، نہ ہی اس کا عربی لغت کی تبدیلی اور ترقی سے تعلق ہے۔ بلکہ اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا، یہ ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس کو لوگ اپنی زندگیوں میں نافذ کرتے ہیں، اس لیے اسلامی اور غیر اسلامی افکار کے درمیان کشمکش ہوتی ہے، نفاذ میں افراط و تفریط ہوتی ہے، نئے واقعات سامنے آتے ہیں جن پر احکامِ شرعیہ کو لاگو کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سب کے نتیجے میں غیر اسلامی افکار کے اسلام میں داخل ہونے کا احتمال ہوتا ہے، افراط و تفریط اور واقعات کے احکامِ شرعیہ سے ربط کے ٹوٹنے کے نتیجے میں فہم کمزور ہو جاتا ہے۔ ان عوامل کی موجودگی میں زیادہ زمانہ گزرنے کے نتیجے میں اسلام اور حقیقت کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے، اس کی وجہ سے تجدید کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

جہاں تک عربی لغت کی تبدیلی کی بات ہے، کئی لغات زمانے کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہیں، یہ لغات کے بارے میں اللہ کی سنت ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہے: ﴿وَٱخۡتِلَٰفُ أَلۡسِنَتِكُمۡ وَأَلۡوَٰنِكُمۡ﴾ **"اور تمہاری زبانوں کا اختلاف اور تمہارے رنگوں کا"** (سورۃ الروم: 22)۔ چنانچہ آج عربوں کی جو زبان ہے یہ بعینہ وہی عربی لغت نہیں جس عربی لغت میں وحی نازل ہوئی بلکہ اس میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور زمانے کے ساتھ اس میں تغیر آیا اور یہ عام بول چال والے لہجوں کا ایک مجموعہ بن گئی۔ لغت میں تجدید کا مقصد عربوں کو فصیح لغت، یعنی قریش کی لغت جس میں وحی نازل ہوئی، اس میں بات چیت کی طرف لوٹانا نہیں ہوتا، یہ نہایت مشکل راستہ ہے اور یہ شرعاً مطلوب بھی نہیں۔ شرعاً مطلوب صرف یہ ہے کہ ہم وحی کی نصوص کو اس آلے کے ذریعے سمجھیں جس میں وہ نازل ہوئی اور وہ اس وقت کے عربوں کی زبان ہے۔ وحی کے منقطع ہونے کے بعد اس میں جو بھی تبدیلی واقع ہوئی وہ کوئی حجت نہیں اور نہ ہی اس پر توجہ دی جائے گی۔

یوں تجدید شرعی نصوص کی اس لغت میں صحیح فہم کے اعادے کا نام ہے جس میں وحی نازل ہوئی اور اس کے منقطع ہونے کے بعد سے لے کر آج تک عربوں کے ہاں اس میں تبدیلی اور اختلاف شامل ہو گیا۔ یہ اس لیے کہ معتبر شرعی خطاب وہ خطاب ہے جس میں وحی نازل ہوئی اور اس میں عربوں کو بطور عرب کے، ان نصوص کے فہم کے مطابق مخاطب کیا گیا۔ اس فہم کا زمانے کے ساتھ ترقی کرنا اور تبدیل ہونا جائز نہیں، بلکہ اس کی بالکل ایسی ہی حفاظت فرض ہے جیسے وحی کے نزول کے اختتام سے پہلے تھا۔ اسی لیے مجدد، مجتہد، مفسر، فقیہ اور شریعت کے تمام علماء کو اس عربی لغت اور اس لہجے کا ماہر ہونا چاہیے جو زبان اور لہجہ قریش اور عرب وحی کے نزول کے وقت بولتے تھے، تاکہ ان میں سے ہر ایک شریعت کے الفاظ کے صحیح معنی کو سمجھنے پر قادر ہو۔

پہلی صدی میں لغت کے ماہرین نے لغت کے کمزور ہونے کی ابتداء سے ہی عربوں کے فصیح قبائل کی تلاش شروع کی، عربی لغت اور عربی شاعری کی کتابت اور تدوین کی، جو عربی ادب کہلاتا ہے۔ انہوں نے اس کو سمجھنے کے لیے ضروری لغوی معارف ایجاد کیے جیسے بلاغت کے علوم، نحو، صَرف، لغت کی فقہ، املاء اور رسم اور معاجم وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ لغت کے علماء اور اسلام کے علماء نے اس معاملے میں ہمیں خود کفیل کر دیا ہے۔ اب ضرورت ان علوم کو پڑھنے اور شرعی نصوص کو سمجھنے میں ان پر اعتماد کی ہے تاکہ ہم بھی ان کو ایسا ہی سمجھ سکیں جیسا رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے سمجھا اور یہی وہ کمال ہے جو درکار ہے۔

اسی طرح تجدید اس حقیقت کو سمجھنے سے بھی ہو گی جس پر وحی کے نزول کے اختتام سے پہلے شرعی احکامات نازل ہوئے یعنی مناط (حکم شرعی کے لاگو ہونے کی حقیقت) کو سمجھنا۔ کسی فقیہ یا مجتہد کی جانب سے شرعی نصوص کا فہم، ان نصوص کے لغوی اور شرعی فہم کے قواعد کے مطابق صحیح ہو گا جس میں کوئی شک نہیں ہو گا لیکن بعض دفعہ اس حقیقت کو سمجھنے اور فرق کرنے میں مشکل درپیش ہو گی جس حقیقت کے ساتھ نص کا تعلق ہے۔ لہٰذا اگر ان نصوص کو ان کے واقعات اور مناطِ شرعی کے علاوہ کہیں دوسری جگہ لاگو کیا جائے تو ایسا کرنے سے خرابی پیدا ہو گی۔ اسی لیے علماء

نے قرآن کے نزول کے اسباب اور احادیث کے وارد ہونے کے اسباب محفوظ کیے، انہوں نے مغازی اور سیرت لکھی تاکہ یہ نصوص کی حقیقت کو سمجھنے میں معاون بنے۔

اس امر میں تجدید ان جگہوں، آثار، حالات، ماحول اور طبعی شرائط کی جستجو ہے جو وحی کے نزول کے زمانے میں موجود تھے۔ اس کوشش میں ممکن ہے کہ تجدید کا فائدہ بڑھ جائے، مثال کے طور پر شرعی وزن اور پیمانوں کی پہچان جیسے صاع، شرعی دینار، ذراع اور قُلّۃ وغیرہ، اُس وقت زیر استعمال قتال اور حرب کے آلات، اُس وقت استعمال ہونے والے لباس اور کھانے کے برتنوں کی معرفت، شہروں اور دیہاتوں میں طرز تعمیر، کنووں، پانیوں، زراعت اور صنعت کے اسالیب کو سمجھنا۔ اس قسم کا علم بہت سارے امور کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے جیسے سفر، پانیوں، راستوں، عمارتوں اور حقِ شفعہ وغیرہ سے متعلق شرعی احکامات۔ یہ سب علوم تحقیقِ مناط اور اس حقیقت کو سمجھنے میں مجتہد اور فقیہ کی معاونت کرتے ہیں جس حقیقت پر شرعی نصوص کا نزول ہوا تھا۔

اس لیے حرمین کی سرزمین میں واہیانہ بہانوں سے اسلامی آثار کو جو تباہ کیا جارہا ہے، یہ بہت بڑا جرم ہے، یہ اہم اسلامی آثار کو ملیامیٹ کررہے ہیں جیسے نبی ﷺ کے گھر، صحابہ کرامؓ کے گھر، قدیم مساجد وغیرہ۔ یہ مسلمانوں اور ان کی تاریخ کے خلاف جرائم ہیں۔ تمام اسلامی آثار کی حفاظت مقصود ہے، خصوصاً وہ جو وحی کے نزول کے زمانے میں موجود تھے کیونکہ ان کا تعلق اس حقیقت کے ساتھ ہے جن کے بارے میں شرعی نصوص نازل ہوئے، یہ احکامِ شرعیہ کی حقیقت، سیرت النبی ﷺ اور مسلمانوں کی تاریخ کو سمجھنے میں کسی نہ کسی طرح ہماری مدد کرتے ہیں۔

اس لیے آج مسلمانوں کو جس تجدید کی ضرورت ہے وہ اسلام کو اسی طرح سمجھنا ہے جیسے وہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کے نزول کے وقت تھا۔ اس کی تجدید ان شرعی نصوص کو سمجھنے اور ان احکامات کی مناط کو سمجھنے میں کمال کے ہدف کے ساتھ معین شرعی اور عقلی ضوابط کی پابندی کرنا ہے جن سے یہ نصوص جڑی ہوئی ہیں اور ان کو ان نئے واقعات پر لاگو کرنا جو اس حقیقت کے موافق ہیں جس کے بارے میں نصوص نازل ہوئے۔ جب ایسی حقیقت رونما ہو جائے جن

کے بارے میں ایسے شرعی احکامات موجود نہیں جن کا احاطہ سابقہ فقہاء نے کیا ہو، تو مجتہدین اور فقہاء اصولِ فقہ کے ضوابط کے مطابق ان نئے واقعات کے لیے اجتہاد کے ذریعے شرعی احکامات کا استنباط کریں گے۔

فہرست

سوال کا جواب: آخرت کے شہید کون ہیں اور شہید کا قرض کون ادا کرتا ہے؟

(عربی سے ترجمہ)

اسماء فوزی محمد کے لیے

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

اسلامی شخصیت جلد دوئم کے صفحہ نمبر 165 پر "شہید" کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے کہ "۔۔۔آخرت کے شہید کے حوالے سے مستند رائے، جیسا کہ مسلم میں روایت کیا گیا، وہ یہ ہے کہ ایسے شہداء پانچ ہیں: المطعون: وہ جو طاعون کی حالت میں موت کا شکار ہوا یعنی معلوم وبائی مرض سے موت کا شکار ہوا، المبطون: جو اسہال (ڈائیریا) کی وجہ سے موت کا شکار ہوا، الغرق: وہ شخص جو پانی میں ڈوب کر موت کے منہ میں چلا گیا، المهدوم: جو عمارت کے ملبے تلے دبنے سے موت کا شکار ہوا، اور وہ جو اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی جدوجہد میں میدان جنگ میں مارا گیا"۔ اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ شہید صرف وہ ہے جو میدان جنگ میں اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے۔ جبکہ عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **« خَمْسٌ مَنْ قُبِضَ فِي شَيْءٍ مِنْهُنَّ فَهُوَ شَهِيدٌ: الْمَقْتُولُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْغَرِقُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْمَبْطُونُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْمَطْعُونُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالنُّفَسَاءُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ »** "پانچ حالتیں ہیں ان میں سے کسی بھی ایک حالت پر بھی مرنے والا شہید ہوگا، جو اللہ کے راستے (جہاد) میں نکلا اور قتل ہو گیا تو وہ شہید ہے، جو جہاد میں نکلا اور ڈوب کر مر گیا تو وہ شہید ہے، جو جہاد میں نکلا اور دست میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا تو وہ بھی شہید ہے، جو جہاد میں نکلا اور طاعون میں مبتلا ہو کر مر گیا وہ بھی شہید ہے، عورت (شوہر کے ساتھ جہاد میں نکلی) اور حالت نفاس میں مر گئی تو وہ بھی شہید ہے" (صحیح)۔ سوال یہ ہے کہ ان دو احادیث کا آپس میں کوئی تعلق بنتا ہے یا یہ ایک دوسرے سے ٹکراتی یعنی متضاد ہیں؟ برائے مہربانی اس معاملے کی وضاحت فرمادیں۔

دوسرا سوال: اسی شہید کے مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **«يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ»** **"شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں سوائے قرض کے"**۔ سوال یہ ہے کہ اگر شہید اپنی شہادت کے بعد اپنا قرض واپس نہیں کر پاتا تو پھر کس کو اس کی شہادت کے بعد اس کا قرض واپس کرنا چاہیے؟ پیشگی شکریہ۔

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

پہلے شہدا کے حوالے سے:

1۔ مسلم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **« بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي بِطَرِيقٍ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ عَلَى الطَّرِيقِ فَأَخَّرَهُ فَشَكَرَ اللَّهُ لَهُ فَغَفَرَ لَهُ وَقَالَ الشُّهَدَاءُ خَمْسَةٌ الْمَطْعُونُ وَالْمَبْطُونُ وَالْغَرِقُ وَصَاحِبُ الْهَدْمِ وَالشَّهِيدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ»"** **ایک شخص جا رہا تھا، اس نے راہ میں ایک کانٹے کی ڈالی دیکھی، اس نے وہ ہٹا دی، اللہ تعالیٰ نے اس کا بدلہ دیا اور اس کو بخش دیا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: شہید پانچ ہیں جو طاعون (وبا یعنی جو مرض تیزی سے پھیل جائے) سے مرے، جو پیٹ کے عارضے سے مرے (جیسے اسہال یا پیچش یا استسقا سے)، جو پانی میں ڈوب کر مرے، جو دَب کر مرے، جو اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کرتا ہوا) مارا جائے"۔**

2۔ عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **« خَمْسٌ مَنْ قُبِضَ فِي شَيْءٍ مِنْهُنَّ فَهُوَ شَهِيدٌ: الْمَقْتُولُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْغَرِيقُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْمَبْطُونُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْمَطْعُونُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالنُّفَسَاءُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ»** **"پانچ حالتیں ہیں کہ ان میں سے کسی بھی ایک حالت پر مرنے والا شہید ہوگا، جو اللہ کے راستے (جہاد)**

میں نکلا اور قتل ہو گیا تو وہ شہید ہے، جہاد میں نکلا اور ڈوب کر مر گیا تو وہ شہید ہے، جہاد میں نکلا اور دست میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا تو وہ بھی شہید ہے، جہاد میں نکلا اور طاعون میں مبتلا ہو کر مر گیا وہ بھی شہید ہے، وہ عورت جو جہاد میں نکلی اور حالت نفاس میں مر گئی تو وہ بھی شہید ہے" (نسائی/طبرانی)۔

3۔ ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ مسلم کی حدیث مطلق ہے: **« الْمَطْعُونُ وَالْمَبْطُونُ وَالْغَرِقُ وَصَاحِبُ الْهَدْمِ»** "جو طاعون، پیٹ کے عارضے، پانی میں ڈوب کر، جو دب کر"۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو یہ ان الفاظ کے ساتھ مقید ہے، **«فِي سَبِيلِ اللَّهِ»** "اللہ کی راہ میں"، **« وَالْغَرِيقُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْمَبْطُونُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ، وَالْمَطْعُونُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ شَهِيدٌ»** "جہاد میں نکلا اور ڈوب کر مر گیا تو وہ شہید ہے، جہاد میں نکلا اور دست میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا تو وہ بھی شہید ہے، جہاد میں نکلا اور طاعون میں مبتلا ہو کر مر گیا وہ بھی شہید ہے"۔

لہٰذا دونوں احادیث کو جوڑا جائے گا اور مطلق کو مقید کے مطابق لیا جائے گا، پس تمام لوگ شہید ہیں اگر وہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، اور **"اللہ کی راہ میں"** کے الفاظ ان کی حد بندی کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر 'اللہ کی راہ میں' کے الفاظ کو مال خرچ کرنے سے جوڑا گیا ہو جیسا کہ "ينفقون فى سبيل الله" یا 'اللہ کی راہ میں' کے الفاظ کا ذکر جہاد کے ساتھ کیا گیا ہو جیسا کہ "يجاهدون فى سبيل الله" تو اس کا معنی ہے ایسا قتال جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے کیا جائے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ذکر کیا گیا کہ ابو موسیٰؓ نے فرمایا: ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ شخص جو مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے اور ایک شخص جو لڑتا ہے تاکہ اس کا رتبہ بلند ہو، تو ان میں سے کون ہے جس نے اللہ کی راہ میں لڑائی کی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ»** "وہ جو لڑتا ہے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، اللہ کی راہ میں لڑنے والا وہی شخص ہے"۔۔۔۔ اگر الفاظ "اللہ کی راہ میں (فى سبيل الله)" کا ذکر بغیر کسی قرینہ کے کیا جائے کہ جو اس کے معنی کی تحدید کرتے ہوں تو یہ اللہ کی اطاعت اور تقرب پر دلالت کرتے ہیں۔ پس جو شخص اللہ کی اطاعت کرنے والا ہو اور اس

طرح مرے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے تو وہ آخرت کا شہید ہے جب کہ اللہ کی راہ میں مارا جانے والا دنیا اور آخرت دونوں کا شہید ہے۔ یعنی مبطون یا مطعون یا غرق ہونے والا۔۔۔ مر جائے اور اللہ کا اطاعت گزار ہو تو یہ شہداء ہیں۔ اگر وہ ان پانچ میں سے نہ ہو اور وہ اللہ کے اطاعت گزار ہو اور مر جائے تو اُس پر اِس حدیث کا اطلاق نہیں ہو گا۔

دوسری بات: جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ کون شہید کے قرض کو ادا کرے گا تو اگر وہ اپنی موت سے پہلے اسے ادا نہیں کر پاتا، تو اس کا قرض اتارنے کی ذمہ داری اس کی ورثاء پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ورثاء یہ قرض اتارنے کے قابل نہ ہوں تو پھر ریاست اس کا قرض ادا کرتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں بتایا گیا: **« أَنَا أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ، مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِأَهْلِهِ، وَمَنْ تَرَكَ دَيْناً أَوْ ضَيَاعاً فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ» "میں ہر مومن سے اس کی جان سے زیادہ قریب تر ہوں پس جو کوئی قرض دار مر جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہو گی اور جو کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے ورثاء کا ہو گا"** (مسلم)۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث جسے ابو داؤد نے روایت کیا کہ جابرؓ نے کہا: **« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم لَا يُصَلِّي عَلَى رَجُلٍ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، فَأُتِيَ بِمَيِّتٍ فَقَالَ: أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟ قَالُوا: نَعَمْ دِينَارَانِ. قَالَ: صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ. فَقَالَ أَبُو قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيُّ: هُمَا عَلَيَّ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: فَصَلَّى عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم، فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: أَنَا أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ. فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ، وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ» "رسول اللہ ﷺ اُس شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے جو اس حال میں مرتا کہ اس پر قرض ہوتا، چنانچہ آپ ﷺ کے پاس ایک جنازہ لایا گیا، آپ ﷺ نے پوچھا" : کیا اس پر قرض ہے؟ "لوگوں نے کہا: ہاں، اس کے ذمہ دو دینار ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا" : تم اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو"، تو ابو قتادہ انصاریؓ نے کہا: میں ان کی ادائیگی کی ذمہ داری لیتا ہوں اے اللہ کے رسول ﷺ! ۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، پھر جب اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو فتوحات اور اموالِ غنیمت سے نوازا تو آپ ﷺ نے فرمایا" : میں ہر مومن سے اس کی جان سے زیادہ قریب تر ہوں پس جو کوئی قرض دار مر جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہو گی اور جو کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے ورثاء کا ہو گا"۔**

میں امید کرتا ہو کہ آپ کے دونوں سوالات کا تشفی جواب دیا گیا ہے، اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ عقل و حکمت والے ہیں۔

آپ کا بھائی

عطا بن خلیل ابو الرشتہ

29 جمادی الاول 1441ھ

24 جنوری 2020ء

فہرست

سوال کا جواب : علاج کا حکم

(عربی سے ترجمہ)

ابو حنیفہ فوالحہ کیلئے

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، جلیل القدر امیر! اگر سوال بوجھل ہو تو مجھے معاف کیجئے، کیونکہ آپ کا وقت اس مصیبت زدہ امت کے لیے خیر کی تلاش میں صرف ہو رہا ہے۔۔۔ مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں اس کو حل نہیں کر سکا۔ کیا علاج فرض ہے یا مندوب یا کچھ اور۔۔۔ امید ہے جواب سے مستفید فرمائیں گے، اللہ برکت دے اور آپ کے ہاتھوں خیر کو کھولے۔

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کے سوال کا جواب کتابچہ "کلوننگ" میں موجود ہے، علاج کے حکم کے حوالے سے اس میں عربی ورڈ فائل کے صفحہ 30-32 میں جو کچھ ہے وہ میں آپ کے لیے نقل کرتا ہوں:

[۔۔۔ وضاحت سے حکم اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم علاج کے بارے میں آنے والے دلائل کو پیش نظر رکھیں۔ بخاری نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«ما أنزل الله داءً إلاّ**

أنزل له شفاءً» "اللہ نے جو بھی بیماری اتاری اس کی شفاء بھی اتار دی ہے" اور مسلم نے جابرؓ بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «لكل داء دواء، فإذا أُصيب دواءُ الداءِ برئ بإذن الله عز وجل» "ہر بیماری کی دوا موجود ہے جب (درست) دوا بیمار کو ملتی ہے اللہ عزوجل کے اذن سے بیمار تندرست ہوتا ہے" اور مسند ابن مسعود کی مرفوع حدیث ہے کہ «إن الله عز وجل لم ينزل داءً إلاّ أنزل له شفاءً علمه من علمه، وجهله من جهله» "اللہ عزوجل نے جو بھی بیماری اتاری ہے اس کی شفاء بھی اتاری ہے کچھ لوگ اس علاج کو جانتے ہیں اور کچھ نہیں"۔

ان تین احادیث میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے بیماری نازل کی اور دوا بھی نازل کی، اگر دوا مل جائے تو اللہ کے اذن سے بیماری ٹھیک ہو جائے گی، اس دوا کا علم کچھ لوگوں کو ہوتا ہے اور کچھ کو نہیں۔ ان احادیث میں ارشاد ہے کہ ہر بیماری کی ایک دوا ہے جس سے اس بیماری سے شفاء ملتی ہے، جس سے اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ علاج کرنا چاہیے جسے اللہ کے اذن سے شفاء ملے گی، بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور علاج بھی اللہ کی طرف سے اور شفاء بھی اللہ کے اذن سے ہے، دوا سے نہیں۔ دوا میں شفاء کی خاصیت رکھی گئی ہے اگر وہ بیماری کے مطابق ہو۔ یہ راہنمائی ہے واجب نہیں۔

احمد نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إن الله عز وجلّ حيث خلق الداء خلق الدواء فتداووا» "اللہ تعالی نے جہاں بیماری پیدا کی ہے اس کی دوا بھی پیدا کی ہے اس لیے علاج کیا کرو"، اور ابو داود اور ابن ماجہ نے اسامہ بن شریک سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ: میں نبی ﷺ کے پاس تھا کہ دیہاتی آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم علاج کرا سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «نعم، يا عباد الله تداووا، فإن الله عز وجل لم يضع داءً إلاّ وضع له شفاءً... » "جی ہاں اے اللہ کے بندو علاج کیا کرو کیونکہ اللہ نے جو بھی بیماری پیدا کی ہے اس کی شفا بھی رکھی ہے"۔

پہلی حدیث میں علاج کا حکم دیا، اس حدیث میں دیہاتیوں کو علاج کے بارے میں سوال کا جواب دیا، جو کہ بندوں سے خطاب ہے کہ علاج کیا کرو، کیونکہ اللہ نے ہر بیماری کی شفاء بھی رکھی ہے۔ دونوں حدیثوں میں خطاب امر کے صیغے کے ساتھ ہے۔ امر مطلق طلب کا فائدہ دیتا ہے، اور وجوب کا فائدہ صرف جازم ہونے کی صورت میں دیتا ہے، جبکہ جزم کے لیے اس پر دلالت کرنے والے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں وجوب پر دلالت کرنے والا کوئی قرینہ نہیں، اور سابقہ تین احادیث میں صرف خبر دی گئی ہے اور راہنمائی کی گئی ہے، چونکہ ان دونوں احادیث میں علاج کا مطالبہ وجوب کے لیے نہیں، مزید یہ کہ علاج کو ترک کرنے کے جواز کے بارے میں بھی احادیث موجود ہیں جو ان دونوں حدیثوں سے وجوب کے فائدے کو ختم کرتی ہیں۔

چنانچہ مسلم نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«يدخل الجنة من أمتي سبعون ألفاً بغير حساب، قالوا من هم يا رسول الله؟ قال: هم الذين لا يَسْتَرْقون، ولا يتطيّرون، ولا يكتوون، وعلى ربهم يتوكلون»** **"میری امت کے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے، لوگوں نے کہا وہ کون ہونگے اے اللہ کے رسول ﷺ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو نہ دم کرتے ہیں نہ کرواتے ہیں نہ فال نکالتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں"**، اور بخاری نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یہ سیاہ فام عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا: مجھے مرگی کا مرض ہے میں بے حجاب ہوتی ہوں، میرے لیے اللہ سے دعا کریں، آپ ﷺ نے فرمایا: **«إن شئتِ صبرتِ ولكِ الجنة، وإن شئتِ دعوتُ الله أن يعافيك»** **"اگر چاہو تو صبر کرو تمہارے لیے جنت ہے اور اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے اللہ سے دعا کروں کہ تمہیں شفا دے"**، عورت نے کہا: میں صبر کرونگی، لیکن میں بے پردہ ہو جاتی ہوں، اللہ سے دعا کریں کہ میں بے پردہ نہ ہو جاؤں۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی"۔ یہ دونوں احادیث علاج کو ترک کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلی حدیث میں جنت میں داخل ہونے والوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دم نہیں کرواتے، فال نہیں نکالتے یعنی علاج نہیں کرواتے، بلکہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑتے ہیں، اپنے امور میں اس پر توکل کرتے ہیں۔ دم کرنا اور فال نکالنا علاج ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دم کرنے کی ترغیب بھی دی اور جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ پر دم کیا۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: **«الشفاء في ثلاثة: في شَرْطَةِ مِحْجَم، أو شَرْبة عسل، أو كَيّةٍ بنار، وأنهى أمتي عن الكيّ» "شفاء تین چیزوں میں ہے: حجامہ کرنے میں، شہد پینے میں اور آگ سے گرم کرنے (داغ دینے) میں ہے اور میں اپنی امت کو داغ دینے سے منع کرتا ہوں"**۔ اس کو بخاری نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔

دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سیاہ فام عورت کو مرگی پر صبر کرکے جنت حاصل کرنے یا اللہ سے دعا کرکے مرگی کا علاج کرنے کے درمیان اختیار دیا، جو کہ علاج ترک کرنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ یوں یہ دونوں احادیث دیہاتیوں کو جواب دینے والی حدیث اور اس پہلی والی حدیث میں امر کو وجوب سے پھیر دیتی ہیں، مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ نے علاج کرنے کی بھرپور ترغیب دی ہے، چنانچہ احادیث میں علاج کرنے کا امر ندب (مندوب ہونے) کے لیے ہے۔]

آپ کا بھائی

عطاء بن خلیل ابو الرشتہ

23 شوال 1442ھ

بمطابق 4 جون 2021ء

فہرست

سوال وجواب: عرب ممالک کے ساتھ چینی سربراہ کی ملاقتوں کے اہداف

(عربی سے ترجمہ)

سوال:

الجزیرہ نے 9/12/2022 کو اپنے ویب سائٹ پر یہ خبر نشر کی کہ، "جمعہ کے دن سعودی دارالحکومت ریاض میں خلیج تعاون کونسل کے سربراہوں اور چین۔ خلیج سمٹ کا ۴۳واں اجلاس ہوا جس میں کئی عرب رہنماؤں کے ساتھ چینی صدر شی جینگ پنگ بھی موجود تھے۔" سعودیہ، خلیجی اور عرب ممالک کے ساتھ ریاض میں اس سربراہی اجلاس کے اہداف کیا ہیں؟ کیا یہ چینی طریقہ کار ہے کہ وہ اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے متعدد طاقتوں پر مشتمل عالمی نظام کی بات کرتا ہے اور اپنے آپ کو بین الاقوامی طور پر بڑی طاقت کے طور پر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ روس کے اس شدت پسندانہ انداز کے برخلاف ہے جس کے ذریعے روس اپنا اثر ونفوذ اور متعدد طاقتوں پر مشتمل کا مطالبہ کرتا ہے؟ کیا عرب خطے کے حکمران اس کی حمائت کریں گے؟ اور اس معاملے پر امریکہ کا رد عمل کیا ہے؟

جواب:

ان سوالات کے جوابات کو واضح کرنے کے لیے ہم مندرجہ ذیل باتوں کی وضاحت کرتے ہیں:

ا۔ چینی صدر شی جین پینگ نے 8/12/2022 کو سعودیہ کا دورہ کیا اور اس کے بادشاہ اور ولی عہد ابن سلمان سے ملاقات کی۔ چین کے صدر کا پرتباک استقبال کی گیا اور فریقین نے جامع اقتصادی شراکت کے معاہدے پر دستخط کیا جس میں توانائی اور انفراسٹریکچر کے میدان میں 30ارب ڈالر کی سرمایہ کاری بھی شامل ہے، اور یہ کوشش کی

گئی کہ چین کے "روڈ اینڈ بیلٹ" اسٹریٹیجک منصوبے اور ابن سلمان کے ویژن 2030 کے منصوبے، جسے عام طور پر "انٹرٹینمنٹ" کہا جاتا ہے، کو ایک ساتھ مربوط کیا جائے۔ اسی طرح خطے کی مارکیٹنگ کے لیے سعودیہ میں چینی مصنوعات کے لیے ایک بڑے مرکز کی بات کی گئی۔اس کے بعد اگلے دن ریاض میں چین کا خلیجی ملکوں کے سربراہوں کے ساتھ اجلاس ہوا، اور اُسی دن عرب سربراہوں کے ساتھ بھی چین کا اجلاس ہوا جس میں بہت سارے عرب "رہنماوں" نے شرکت کی جس کے بارے میں چینی وزارت خارجہ نے کہا کہ جمہوریہ چین کے قیام کے بعد سے "۔۔۔ چین اور عرب دنیا کے درمیان ہونے والی سب سے بڑی سفارتی سرگرمی۔۔۔"(بی بی سی 8/12/2022)۔دونوں سمٹس نے عرب اور چین کے درمیان دوطرفہ اقتصادی شراکت اور تعاون پر زور دیا اور اختتامی بیان میں عام امور کا ذکر کیا گیا جیسے کہ موجودہ عالمی نظام کا احترام، ملکوں کی خود مختاری کا احترام، طاقت کے استعمال سے گریز، ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات، فلسطینی مسئلے کی مرکزیت اور ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا۔ چین- خلیج سربراہی اجلاس کے اختتامی بیان میں چین نے ایران پر تنقید کرتے ہوئے پڑوسیوں کے احترام پر زور دیا، اور کل خلیجی ممالک اور چین نے ریاض میں چین اور خلیجی ممالک کے مشترکہ اجلاس کے اختتام پر بیان جاری کیا گیا جس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ "متحدہ عرب امارات کی جانب سے تینوں جزیروں کے مسئلے کو پرامن مذاکرات سے حل کرنے کی حمایت کرتے ہیں"، جن کو ایران اپنا حصہ سمجھتا ہے۔اس کے ساتھ ہی ایران سے "ایٹمی معاہدے کے لیے سنجیدہ مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کا مطالبہ کیا گیا"(المیادین 10/12/2022)،اس اعلان پر تہران میں چینی سفیر کو طلب کر کے چین کے اس موقف پر احتجاج کیا گیا۔

2۔امریکہ کی نئی حکمت عملی کے مطابق چین ہی دنیا میں امریکی بالادستی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، اور وہ دنیا پر اپنا مؤثر اثر ورسوخ قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ چین ہی امریکہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی معیشت ہے، اور عسکری اخراجات کے لحاظ سے بھی وہ دوسری بڑی ریاست ہے۔ لہٰذا امریکہ نے چینی اقدامات پر نظر رکھی ہوئی ہے، اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اقدامات کر رہا ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ جنگ کی تیاری کر رہا ہے جیسا

کہ تائیوان کے بارے میں امریکی صدر کے حالیہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ امریکہ نے چینی صدر کے اس دورے پر یہ کہہ کر تبصرہ کیا، (وائٹ ہاوس نے بدھ کو کہا" یہ کوئی تشویش کی بات نہیں" کہ چینی صدر شی جین پینگ نے سعودیہ کا دورہ کیا ہے کیونکہ چین" مشرق وسطی میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے"۔ امریکی قومی سلامتی کمیٹی میں اسٹریٹیجک رابطوں کے ذمہ دار جان کیربی نے بھی کہا کہ،" ہم جانتے ہیں کہ چین دنیا بھر میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے،" انہوں نے یہ بھی کہا کہ،" چینی صدر شی کا دورہ حیران کن نہیں، بالکل بھی حیران کن نہیں کہ انہوں نے مشرق وسطیٰ جانے کا فیصلہ کیا"۔ (سی این این عربی 8/12/2022)

3۔ دوسری طرف چین امریکہ کے عالمی نظام کی مخالفت سے اجتناب کر رہا ہے، کیونکہ چین وہی کہہ رہا ہے جو امریکہ کہہ رہا ہے، اور یہ چینی صدر کے دورے میں بھی واضح نظر آیا جب اختتامی بیان میں موجودہ عالمی نظام اور بین الاقوامی قانون کی پاسداری، ایٹمی ہتھیاروں کی پھیلاؤ کو روکنے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بات کی گئی۔ درحقیقت ریاض میں چین عرب سربراہی اجلاس کے اختتامی بیان میں روس پر بلواسطہ انداز میں تنقید کی گئی جب دوسرے ملکوں کی خود مختاری، طاقت کے استعمال سے اجتناب اور اچھی ہمسائیگی کے اصولوں کا احترام کرنے کی بات کی گئی، یہ روس کی جانب سے یوکرین پر حملے کی طرف اشارہ تھا۔ اختتامی بیان میں چین کی جانب سے ایران پر تنقید اور دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی تنبیہ درحقیقت مغربی ممالک اور امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانا ہے ۔ ایران کی جانب سے چینی سفیر کو بلا کر احتجاج کرنا روس، چین، ایران اور شمالی کوریا پر مشتمل" نئے عالمی کیمپ" کی تشکیل کی نفی کرتا ہے بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کیمپ ایک خیالی بات ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

4۔ جہاں تک چین اور عرب تعلقات کی بات ہے تو سعودیہ میں سربراہی اجلاس عالمی سطح پر کسی تبدیلی کی نشانی نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ سعودیہ نے چینی صدر کا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا جبکہ 2022 میں امریکی صدر بائیڈن کے دورے میں یہ گرم جوشی نظر نہیں آئی تھی، مگر یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی اور بائیڈن کے ساتھ ریپبلکن پارٹی کے جھگڑے میں سعودیہ ریپبلکن پارٹی کے ساتھ کھڑا ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ امریکی

صدر بائڈن نے بھی ابن سلمان کا کوئی احترام نہیں کیا۔ یہ بات بھی ہے کہ عرب ممالک نے چین کے علاوہ ہندوستان اور جرمنی سے بھی شراکت کے اسی قسم کے معاہدے کیے ہیں جو کسی بھی لحاظ سے وفاداری اور سیاسی تابعداری میں تبدیلی کا مظہر نہیں ہیں۔

5۔ چین اپنی سرحدوں کے ارد گرد ہی بڑے سیاسی مسائل میں پھنسا ہوا ہے جیسا کہ تائیوان میں، جس کو وہ اپنا حصہ قرار دیتا ہے مگر اب تک اس کو اپنے اندر ضم نہ کر سکا، اسی طرح ویتنام میں، اور کئی ہمسائیہ ممالک کے ساتھ جزائر کے تنازعات ہیں، اس کے قریبی تعلقات اور وفاداری شمالی کوریا تک ہی محدود ہے، اس لیے یقینی بات ہے کہ چین عرب خطے میں اپنے لیے سیاسی وفاداری پیدا کرنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کر رہا ہے، خاص کر جب وہ یہ جانتا ہے کہ عرب حکمرانوں کا امریکہ اور برطانیہ سے تعلق بہت مضبوط ہے۔ اسی لیے چینی صدر کے دورے میں سربراہی ملاقتوں اور اقتصادی معاہدوں کا سیاسی تابعداری پیدا کرنے سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں، یہ صرف ممالک کے درمیان کھلے اقتصادی تعلقات کے فروغ تک محدود ہیں، ان کو صرف اقتصادی نقطہ نظر سے ہی دیکھنا چاہیے، اس میں کوئی سیاسی عزائم نہیں نہ ہی خطے کے حکمرانوں کی سیاسی وفاداری تبدیل کرنے سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ مثال کے طور چین کا ایران پر تنقید کرنا مغرب کی ہاں میں ہاں ملانا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چین ایران پر تنقید کرنے والے مغرب کے صف سے نکل کر کہیں نہیں جا رہا، نہ ہی چین ایران کے خلاف خلیجی ممالک سے مل کر کوئی سیاسی اقدامات کر رہا ہے۔ اسی طرح اختتامی بیان میں دوسروں کی خود مختاری کا احترام، طاقت کے استعمال سے اجتناب، ہمسائیوں سے اچھے تعلقات کی باتیں کر کے روس پر بلواسطہ تنقید کی گئی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چین یوکرین جنگ کے حوالے سے روس کے ساتھ کوئی اتحاد قائم نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے دنیا کے ساتھ تعلقات میں پرامن سفارتی طریقہ کار اپنایا ہوا ہے۔

6۔ چین صرف اقتصادی لحاظ سے خلیج کے خطے کے قریب ہو رہا ہے کیونکہ وہ بہت ڈر رہا ہے کہ امریکہ اور یورپ، چین کی صنعت کی پہنچ کو محدود کر دیں گے خاص طور پر مغربی مارکیٹ کو اس کی برآمدات کو منقطع کر دیں گے۔

آج کل جو بات یورپ میں روسی توانائی کے وسائل پر بھاری انحصار میں سٹریٹیجک خرابی کے حوالے سے ہو رہی ہے، بالکل وہی ہے جو مغرب میں چینی مینوفیکچرنگ اداروں پر زبردست انحصار سے ہو رہی ہے اور اس کے بارے میں مضبوط اشارے سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ جرمن وزیر خارجہ بربوک(Baerbock) نے کہا،"روس کے ساتھ جرمن تجربہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہم کسی ایسے ملک پر انحصار نہیں کریں گے جس کے اور ہماری اقدار مشترک نہ ہوں۔ کسی ملک پر مکمل اقتصادی انحصار سے سیاسی بلیک میلنگ کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔"(المیادین 2/11/2022)۔ جرمن چانسلر شلز (Schulz) نے بیجنگ سے روانگی کی شام اخبار فرینکفرٹر زیٹنگ (Frankfurter Zeitung) میں لکھے گئے اپنے مضمون میں کہا کہ،" برلن کو چین کے ساتھ نمٹنے کے طریقے کو تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ یہ ملک مزید کھلے عام "مارکسسٹ-لیننسٹ" سیاسی راستے کی طرف لوٹ رہا ہے۔"انہوں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے لکھا کہ جرمن کمپنیوں کو چاہیے کہ چینی سپلائی پر "خطرناک اعتماد کو کم کرنے" کے اقدامات کریں۔(الشرق الاوسط 4/11/2022)۔اسی تناظر میں اور اسی سے بچنے کے لیے چین حفاظتی اقدامات کر رہا ہے کہ مغرب کو چینی مال سپلائی کو ختم ہونے سے بچایا جائے اور اس کے ساتھ وہ نہ ہو جو روسی مال کے ساتھ ہوا خاص کر توانائی کے حوالے سے،اب تک اس حوالے سے چین کے حفاظتی اقدامات میں سے نمایاں یہ اقدامات ہیں:

ا۔**روس سے خود کو دور رکھنا:** یوکرین پر روسی حملہ شروع ہوتے وقت چین کو کچھ امید تھی کہ روسی صدر شاید یوکرین پر اپنا تسلط قائم کر کے کوئی بڑا عالمی کردار ادا کریں گے اس لیے شروع میں چین کی پالیسی مبہم تھی۔ مگر امریکی اور یورپی امداد نے یوکرین کو ڈٹ جانے کی قوت بخشی اور پھر چین نے روس سے دور ہونا شروع کیا اور روس پر اشاروں کنایوں میں تنقید شروع کی، اس کا مشاہدہ اکتوبر 2022 میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس کے بعد چینی صدر شی جین پینگ کی جانب سے معاملات پر مکمل کنٹرول اور اپنے مخالفین کو اپنے سیاسی دفتر سے دور کرنے کے بعد کیا جانے گا۔ اس کے بعد چین سر پھرے روس سے مزید دور ہونے لگا۔ چین اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ امریکہ اور یورپی ممالک

چینی مال کو لینا بند کر دیں جیسا کہ روسی توانائی کی سپلائی کے ساتھ کیا گیا کہ یورپ نے اس کے لینے پر پابندی عائد کر دی گئی، لہٰذا چین نے اس بات کو پیش نظر رکھا۔

ب۔ **مغرب کی ہاں میں ہاں ملانا:** چین امریکی عالمی نظام کی پابندی کا اعلان کر رہا ہے اور ہر اس بات پر تنقید کر رہا ہے جس پر مغرب تنقید کرتا ہے جیسے ایران کی جانب سے خلیجی ممالک کے معاملات میں مداخلت پر مغرب تنقید کرتا ہے۔ اس طرح چین مغرب کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ وہ بھی دنیا کے "مہذب" ممالک میں سے ایک ہے جو بعض ممالک (جیسے روس) کی جارحانہ پالیسیوں کی مخالفت کرتا ہے، ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں چین کے اس موقف میں مزید وضاحت دیکھنے کو ملے، اور اس حوالے سے چین کی جانب سے تائیوان کے ساتھ کسی قسم کے عسکری تصادم سے اجتناب اور اس مسئلے پر امریکہ سے کشیدگی میں کمی کا مطالبہ، اور شمالی کوریا کے ایٹمی مسئلے کو حل کرنے میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنا اہم ہے۔ ان سب اقدامات کا ہدف چینی مصنوعات کی سپلائی روکنے کی امریکی اور یورپی پالیسی سے بچنے کوشش ہے۔

ج۔ **متبادل اقتصادی ذرائع کا بندوبست کرنا:** چین عرب ممالک کی مارکیٹوں کو متبادل کے طور پر دیکھ رہا ہے اگرچہ یہ مغربی مارکیٹ سے کم اہم ہے، یعنی امریکہ اور یورپ کی جانب سے چینی سپلائی ختم کرنے یا اس میں کمی کرنے کی صورت میں عرب مارکیٹ کسی حد تک متبادل کا کام کرے گی، لیکن یہ امریکی اور یورپی مارکیٹ کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ اگر اس مارکیٹ کو افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مقابلے میں دیکھا جائے تو چینی معیشت کے لیے دم گھٹنے کے وقت یہ کسی نہ کسی حد تک سانس لینے کا ذریعہ بن سکتی ہے اور امریکہ اور یورپ کی جانب سے چین پر انحصار کم کرنے کی صورت میں یہ مارکیٹ چین کے کام آسکتی ہے۔

7۔ جہاں تک عرب ممالک کی اقتصادی پہلو کی بات ہے تو یہ سمٹس، چاہے خلیجی ہوں یا عرب، ان کی حیثیت کچھ یوں ہے:

ا۔ان عرب ممالک میں دھائیوں کی ناکام حکمرانی کے بعد یہ حکومتیں سوکھے ہوئے جنگل کی طرح ہو چکے ہیں، اور اس انتظار میں ہیں کہ کوئی آکر انہیں سنبھالے۔ان میں سے بعض ممالک اپنے ٹیکسوں کا آدھا قرضوں کے سود کی ادائیگی پر خرچ کرتے ہیں۔ان کی کرنسیاں بہت زیادہ گر گئی ہیں،اور ناکام معاشی پالیسیوں اور مغرب کی حد سے زیادہ غلامی کی وجہ سے کی وجہ سے یہاں قیمتیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں، اور اس صورتحال میں یہاں بھرپور احتجاج کا خطرہ ہے۔ خلیجی ممالک کے علاوہ باقی تمام عرب ممالک شدید معاشی مسائل سے دوچار ہیں۔ان مسائل کی وجہ سے ان ممالک کے حکمران چین کو ممکنہ معاشی نجات دہندہ سمجھتے ہیں، جس سے مزید قرضے لینے کا امکان ہے تاکہ آئی ایم ایف کے بعض سخت شرائط سے بچا جاسکے۔ چین،اپنے بڑے بیرونی منصوبوں کے ذریعے،ان ممالک میں بڑی سرمایہ کاری کر سکتا ہے جس کا فائدہ حکمران طبقے میں پھیلی کرپشن کی وجہ سے یہاں کے حکمرانوں اور ان کے آلہ کاروں کو ہوگا۔

ب۔ جہاں تک امریکہ کی بات ہے تو اس کے معاشی مسائل نے اس کو اپنے ایجنٹوں پر زیادہ انحصار کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جیسا کہ خیالی اسلحے کے معاہدے جو ٹرمپ انتظامیہ نے سعودیہ کے ساتھ کیے تھے، بلکہ وہ تو دوسروں کے ایجنٹوں پر بھی اپنے معاشی فوائد کے حصول کے لیے دباؤ ڈلتا ہے جیسا کہ اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے قطر پر دباؤ ڈالا جو کہ برطانوی ایجنٹ ہے یہاں تک کہ قطر کی دولت امریکہ کے لیے سرمایہ اور امریکی حکمرانوں کے لیے اپنے اقتدار بچانے کا ذریعہ بن گئی۔امریکی صدر ٹرمپ نے تو خطے کے حکمرانوں سے ان کی حفاظت کے بدلے ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ چونکہ ان حکمرانوں کو بڑے مسائل کا سامنا ہے اس لیے امریکہ خود ان کو چین کے ساتھ اقتصادی تعلقات بڑھانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے یا ان کو اس عمل سے منع نہیں کرتا،اور ممکن ہے کہ امریکہ چین کی معیشت پر بوجھ ڈالنے کی پالیسی کے طور پر ان سمٹس کے ذریعے خطے میں اپنے ایجنٹوں کو معاشی امداد دلوا رہا ہے تاکہ چین کی معاشی ترقی کو روکا جا سکے،یعنی چین - عرب تعاون اور اقتصادی شراکت کسی بھی طرح ان حکمرانوں کی سیاسی وفاداری بدلنے کے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

8۔ ان سب باتوں سے ان سمٹس کے حوالے سے چینی اہداف واضح ہو جاتے ہیں جو کہ مکمل طور پر صرف معاشی اہداف ہیں، اور چین عرب دنیا میں امریکہ اور برطانیہ کے اثر و رسوخ کا مقابلہ نہیں کر رہا ہے، کیونکہ اس کے پاس ایسا کرنے کی نہ صلاحیت ہے نہ ارادہ، بلکہ وہ تو مشرقی ایشیا میں اپنے ارد گرد امریکی سیاسی اثر و رسوخ کو اپنے حق میں نہیں کر سکتا۔ چین ان سمٹس معاہدوں اور اُن اقتصادی شراکت داریوں کے معاہدوں سے جن پر اس نے دستخط کیے ہیں یہ چاہتا ہے کی اس کی معیشت چلتی رہے چاہے وہ خلیج سے آنے والی توانائی کے حوالے سے ہو یا اس کی مصنوعات کے لیے عرب ممالک کی مارکیٹ کی شکل میں ہو۔ وہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھا کر یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مہذب دنیا کا حصہ ہے، اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کیمپ کا حصہ نہیں جس کو مغر" سرکش ممالک "کا کیمپ کہتا ہے جیسے شمالی کوریا اور ایران۔ وہ ایسی عالمی تنہائی سے بچنا چاہتا ہے جس کا پھندا آج روس کا گلہ گھونٹ رہا ہے کہ کل اس کے گلے میں ڈال دیا جائے۔ چین عرب خطے، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ساتھ اقتصادی تعلقات بنانا چاہتا ہے تاکہ یہ مغربی مارکیٹ کا متبادل ہوں، اور یہ بندوبست اس وقت کے لیے ہے جب چین پر مغربی دباؤ بڑھ جائے اور مغربی ممالک چینی مصنوعات کی سپلائی لینے سے انکار کر دیں۔ چین ایسی صورتحال کی تلافی اور اس میں تخفیف کی پالیسی پر گامزن ہے، اور اسی لیے اس نے روس سے دور رہنے کی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔

9۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ ان اجلاسوں اور سمٹس کے دوران "عرب حکمرانوں" کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ چین سنکیانگ "مشرقی ترکستان" کے خطے کے مسلمانوں کے خلاف کس قدر وحشیانہ مظالم کر رہا ہے۔ یہ حکمران چینی صدر سے "پیار" کی باتیں کرتے رہے، اور اُن جرائم کے حوالے سے چینی صدر سے بات ہی نہیں کی گویا ایسا کچھ نہ ہو رہا ہو! یہ عمل اگر کسی چیز پر دلالت کرتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ان حکمرانوں نے مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑنے میں تمام حدیں پار کر لی ہے اور مسلمانوں کی حالت زار ان کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ ان سب حکمرانوں کے لیے اہم مسئلہ عوام پر ظلم اور ان سے دشمنی کے باوجود اپنی حکمرانی کی کرسی بچانا ہے، جبکہ مسلمانوں کی زندگی سے متعلق ہر مسئلے

کے حوالے سے یہ مکمل طور پر ناکام ہو گئے ہیں۔ ان کی بات چیت اور توجہ اقتصادی تعلقات اور بین الاقوامی تجارت پر مرکوز ہے گویا ایغور مسلمانوں پر چینی مظالم کی بات کسی اور سیارے کی ہے!

10۔ آج عرب حکمران بلکہ عالم اسلام کے تمام حکمران خلافت کے انہدام کے بعد سب سے بری حالت میں ہیں، اور یہ وہ حالت ہے جو خبردار کر رہی ہے کہ وہ فنا (ختم) ہونے کے قریب ہیں۔ یورپ اور امریکہ، بلکہ چین کے ساتھ بھی مل کر انہوں نے جو تباہی مچائی ہے وہ اتنی بڑی ہے کہ وہ اس کا سامنا کرنے میں مشکلات کا شکار ہے جبکہ وہ کوئی ایسی کامیابی حاصل کرنے سے بہت دور ہیں جو ان کے مسلسل حکمرانی کا جواز پیش کر سکے، اور جو چیز ایک حکمران کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کون کم ناکام ہے۔۔۔۔ اور ان پر اللہ کا غضب اس کے علاوہ ہے، کیونکہ انہوں نے اسلام کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور زمین میں اسلامی طرز زندگی کی واپسی کی جدوجہد کرنے والوں کے خلاف جنگ برپا کر رکھی ہے اور ہر استعماری کافر کے حکم کی پیروی کرتے ہیں گویا کہ یہ ہوش میں ہی نہیں ہیں۔ ﴿**أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ**﴾ **"یہ مردہ ہیں زندہ نہیں، یہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔"** (النحل، 16:21)

22 جمادی الاولی 1444 ہجری

بمطابق 16 دسمبر 2022

فہرست

آج پاکستان کا سیاسی طور پر مفلوج ہونا اور عدم استحکام اُس ناکام طرزِ سیاست کا براہ راست نتیجہ ہے، جو حکمران طبقہ کا خاصہ ہے۔ پی ٹی آئی، مسلم لیگ ن، پی پی پی اور دیگر سیاسی جماعتیں اپنی طرزِ سیاست میں سیاست کے متعلق مغرب کے تصور سے متاثر ہیں، نتیجتاً ان کی سیاسی کوششوں کا تمام تر محور ہر قیمت پر اقتدار کا حصول اور حکومتی سیاستدانوں، جرنیلوں اور اعلیٰ عدلیہ کے مفادات کا تحفظ ہے۔ سویلین بالادستی، قانون کی بالادستی اور عوام کی حکمرانی جیسے نعروں کے نام پر کی جانے والی یہ سیاست، جرنیلوں، سیاست دانوں اور ججوں کے مفادات کو پورا کرنے کے گرد گھومتی ہے جو طاقت کے حصول اور ملکی وسائل میں زیادہ سے زیادہ حصہ وصول کرنے کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ یہ سیاسی سودے بازی کرنے، مغربی مفادات اور بین الاقوامی اداروں کی خدمت کرنے اور ایسے قوانین منظور کرانے کی سیاست ہے، جس کے نتیجے میں جرنیلوں، سیاست دانوں اور ججوں کی مدتِ ملازمت یا اقتدار میں توسیع ہو یا ان کو ملنے والی مراعات میں اضافہ ہو، اور سیاسی جماعتوں کے وفاداروں اور ان کی مالی معاونت کرنے والوں کو نوازا جائے۔ پاکستان کے مسلمانوں کی بدحالی کو ختم کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی آپشن نہیں کہ موجودہ سیاست، جو طاقت و اقتدار کی ہوس کی بنیاد پر کھڑی ہے، کو مکمل طور پر مسترد کر دیا جائے اور اسلام پر مبنی نئی سیاست کو اپنایا جائے۔

(پاکستان کی ضرورت ایک نئی سیاست اور نئی ریاست کا قیام ہے،
جس کی بنیاد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی وحی ہو
اور یہ صرف خلافت کے قیام کے ذریعے ممکن ہے)

www.hizb-ut-tahrir.org
www.hizb-ut-tahrir.info
https://www.hizb-pakistan.com

حزب التحریر ولایہ پاکستان
29 جمادی الاول، 1444ھ
بمطابق 23 دسمبر 2022

نُصرۃ

نصرۃ وہ حکمِ شرعی ہے کہ جس پر آج سیاسی طور پر امت مسلمہ کے مستقبل کا دارومدار ہے کیونکہ نصرۃ کے ذریعے ہی اُس ریاستِ خلافت کا قیام عمل میں آئے گا جو ان غداریوں اور خیانتوں کے طویل سلسلے کا خاتمہ کرے گی جس کا امت کو سامنا ہے، جو اللہ کے نازل کردہ تمام تر احکامات کے ذریعے حکمرانی کا آغاز کرے گی، پوری امت مسلمہ کو ایک ریاست کے سائے تلے وحدت بخشے گی اور دعوت و جہاد کے ذریعے اسلام کے پیغام کو پوری دنیا تک لے جائے گی۔

نصرۃ کی دلیل ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے ملتی ہے کہ جب مکہ کا معاشرہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جامد ہو گیا تو اللہ سبحانہ تعالی نے آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ آپ مختلف قبائل پر اپنے آپ کو پیش کر کے اِن کی حمایت و نصرت طلب کریں۔

پس آپ ﷺ نے ابو طالب کی وفات کے بعد مختلف عرب قبائل کی طرف رجوع کیا یہاں تک کہ مدینہ کے اوس و خزرج قبائل کے سرداروں نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ ﷺ کو نصرۃ دی اور اس نصرت کے نتیجے میں ہی بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اور یوں وہ رہتی دنیا تک انصار کے لقب سے پہچانے گئے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کی افواج میں موجود مخلص افسران اپنے انصاری بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلافت کی دعوت کے علمبرداروں کو نصرۃ فراہم کریں، اس کفریہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو اکھاڑ پھینکیں اور ایک خلیفۂ راشد کو قرآن و سنت کے نفاذ پر بیعت دیں اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی اس بشارت کے پورا کریں کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا: **«ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ»** "پھر ظالمانہ حکمرانی کا دور ہو گا اور اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہیں گے۔ پھر اللہ اس کو ختم فرما دیں گے جب وہ چاہیں گے۔ اس کے بعد نبوت کے نقش قدم پر خلافت قائم ہو گی" (مسند امام احمد)